دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

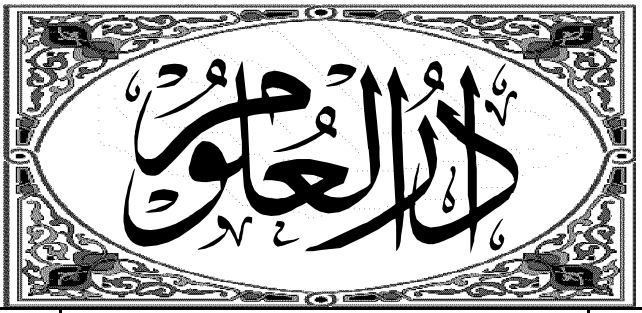

جلد: ۱۰۰	ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۶ء	شمارہ: ۹

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 100, Issue No. 9, September 2016 सितम्बर 2016
Printer Publisher :- Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Habibur Rahman Azmi
Owner :- Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 40/=	Annual Subscription Rs. 200/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپے

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	الفاظِ سلام کی تعریف وتنکیر	مولانا محمد تبریز عالم قاسمی	۷
۳	گناہ — پریشانیوں کا سبب	مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی	۱۵
۴	اسلام میں وصیت کا قانون	مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی	۲۶
۵	سلطان ٹیپوؒ اور مذہبی رواداریاں	معاذ کولہاپوری	۳۳
۶	خیر الکلام فی کشف أوہام الأعلام	مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی	۳۸
۷	حضرت مفتی محمد سہول عثمانیؒ - صدر مفتی دار العلوم دیوبند	مولانا رفیق احمد بالاکوٹی	۴۶

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان اپنی پوری تاریخ میں تقریباً پہلی بار ایک بیرونی ملک یعنی برطانیہ کے زیرتسلط آیا، جو وطنِ عزیز ہندوستان سے کئی ہزارمیل کے فاصلہ پر تھا، مسلم فاتحین جو افغانستان اور وسط ایشیا سے آئے، ان کی بہرحال ایک مختلف کہانی ہے، یہ باہری حکمراں اگرچہ اپنے دین ومذہب پر قائم رہے، اپنی تہذیب اور کلچر کا بھی بڑا حصہ اپنائے رکھا؛ لیکن انھوں نے اس ملک میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کیا اور اپنے بیرونی ہونے کے خیالات کو خیرباد کہہ کر اپنی قسمت ابنائے ہند کے ساتھ وابستہ کردی، ہندوستانی زندگی اور ابتدائی تہذیب کے اصول بھی انھوں نے اپنے اندر سمو لیے، ہندوستان جو بہت سے مذاہب کا ایک گنجینہ تھا، ایک مزید مذہب کے اضافہ سے اور بھی مال دار اور اس نئے عناصر کے شامل ہونے سے اس کی رنگ برنگی تہذیب میں اور بھی تنوع آگیا، ہندوستان کے بسنے والوں نے ان نئے آنے والوں کو تہذیبی طور پر بہت کچھ دیا تو معاوضہ میں بہت کچھ ان فاتحین سے پایا بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

بہرحال تاریخ بتاتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغلیہ سلطنت کا ڈھانچہ ٹوٹنے لگا اور وقت جوں جوں آگے بڑھتا گیا، حکومت کے زوال کی رفتار تیز ہوتی گئی، جس کے نتیجہ میں مرکز گریز قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کردیا، قانون وضابطہ منتشر ہوگیا، اجتماعی اور شخصی اخلاق کی چولیں ہل گئیں، شہنشاہیت ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی، یہی وہ زمانہ ہے جب یورپی اقوام کے ایجنٹوں نے ہندوستان کے معاملات میں دخل اندازی شروع کردی اور پھر آگے بڑھ کر

تجارت کے عنوان سے ملک کے مختلف خطوں میں منتشر برطانیہ کے تاجر نما آزمودہ کار سپاہیوں نے ملک کے اقتدار پر اپنا قبضہ جمالیا، اس طرح تقریباً دوصدیوں تک وطن عزیز ایک بیرونی طاقت کا غلام رہا؛ لیکن یہ بھی ایک تاریخی عجوبہ سے کم نہیں ہے کہ اسی ملک پر قابض اور سیاہ وسفید کی مالک بیرونی حکومت کے زمانہ ہی میں اس کی تمام تر حربی طاقتوں کے باوجود ملک کے جیالے سپوتوں نے اسے دیس نکالا دے کر اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرلی اور ملک کے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

یہ عجوبہ یونہی اتفاقاً نہیں رونما ہوا؛ بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل، بے پناہ جاں فروشیوں اور ایثار وقربانی کی خوں چکاں داستان ہے، افسوس ہے کہ اجنبی اقتدار کے جوئے کو کاندھے سے اتار پھینکنے کے لیے ملک کے عوام کی اس عظیم تحریک کو ایک زمانہ تک بغاوت، شورش، فساد، ہنگامہ، غدر وغیرہ نہ جانے کتنے حقیر وذلیل ناموں سے ذکر کیا گیا، مزید افسوس اور حیرت تو اس پر ہے کہ خود ملک کے بعض نامور افراد بھی انگریز نوازی، ذاتی مفاد یا بزعم خویش قومی بہبود کے تحت اس خلافِ واقعہ، کردار کُش مہم میں غاصب حکومتِ وقت کے ہم زبان وہم نوا بن گئے، کم وبیش پچاس سال تک تاریخ کے ساتھ ناانصافی کا یہ سلسلہ جاری رہا، پھر رفتہ رفتہ صحیح واقعات ومشاہدات کو دنیا کے سامنے پیش کیے جانے کا حوصلہ بیدار ہوا اور تحریکِ حریت سے متعلق چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہونا شروع ہوگئیں؛ البتہ تمام احوال ووقائع پر قومی انداز میں غور وفکر کا واضح آغاز اس وقت ہوا جب اجنبی حکومت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ آزاد وطنی حکومت نے سنبھال لی، اس طرح تحریک حریت کی حقیقی اور سچی عظیم الشان تاریخ عالم آشکارا ہوگئی، جسے بیرونی حکومت اور اس کے بہی خواہوں نے اپنی مصلحتوں کے تحت ناپسندیدہ رنگ دینے کی ظالمانہ کوشش کی تھی۔

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اجمالی طور پر جنگ حریت کی صدیوں پر محیط تاریخ کو تین مرکزی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جس کے تحت جہد وجنگ کی بہت ساری ولولہ انگیز داستانیں داخل ہیں۔

دوراوّل: اس دور کے آغاز کا منشا ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے جارحانہ اقدامات اور ملک پر اس کے تسلط کو بچانا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن بہ خوبی اس حقیقت سے واقف

تھے کہ بوڑھی مغلیہ حکومت امرائے سلطنت کی باہمی کشاکش اور ریشہ دوانیوں سے بے حال ہوچکی ہے اس کے اندر مقاومت کی ادنیٰ ہمت بھی نہیں ہے؛ اس لیے وہ دہلی پر بلا تاخیر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے؛ لیکن وہ اپنے اس منصوبہ کو بروئے کار لانے میں اس لیے پس وپیش میں تھے کہ ریاست بنگال جو اس وقت ہندوستان کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے، ہماری راہ میں اڑچن کھڑی کرسکتی ہے، انھیں شیرِ میسور سلطان ٹیپو شہید سے بھی خطرہ تھا کہ اپنے جیتے جی وہ ہندوستان کو غلام دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا ہے، علاوہ ازیں انھیں روہیلوں سے بھی خوف تھا؛ اس لیے انھوں نے دلی پر قبضہ سے پہلے ان تینوں مذکورہ طاقتوں کو ختم کردینا ضروری سمجھا۔ المختصر مئی ۱۷۵۷ء پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی فوج سے ان کا مقابلہ ہوا اور پہلے ہی حملہ میں انگریز سپاہی پسپا ہوگئے اور ''فورٹ ولیم'' پر سراج الدولہ کا قبضہ ہوگیا، بالآخر انگریزوں نے سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کو لالچ دے کر اپنا ہم نوا بنالیا اور غدارِ قوم ووطن نے عین جنگ کے وقت دھوکہ دیا، اس طرح جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی اور سراج الدولہ کے خون سے حکومت بنگال کا پٹہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام لکھا گیا، یوں اڑیسہ، بہار تک انگریزوں کا راستہ صاف ہوگیا؛ کیونکہ بہار اور اڑیسہ اس وقت بنگال ہی کے تابع تھے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس سے پہلے یعنی ۱۷۷۴ء میں انگریزوں نے شجاع الدولہ (والیِ اودھ) کو ترغیب ومدد دے کر روہیل کھنڈ پر چڑھائی کرادی جس کے نتیجے میں کٹرہ میران پور کی وہ مشہور جنگ ہوئی جس میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے، روہیلوں کا قتل عام ہوا، ان کا مال واسباب تاراج اور جائدادیں ضبط کرلی گئیں، اس طرح شجاع الدولہ کی انگریز نوازی سے یہ کانٹا بھی راستہ سے صاف ہوگیا۔

اس طرح شمالی ہند میں چاٹگام سے لے کر دہلی کی دیواروں کی پشت تک انگریزی اقتدار کا تسلط قائم ہوگیا، جنوبی ہند میں حیدرآباد نے تو انگریزوں سے دوستی کرلی تھی، اب صرف ٹیپو سلطان اور مرہٹے ہی مخالف تھے، پہلے مرہٹوں کو تھپک کر خاموش کیا، اس کے بعد میسور کی طرف متوجہ ہوئے۔ میر صادق وغیرہ سلطان کے غدار ساتھیوں نے خفیہ ساز باز کرلی تھی، اب

ایک معرکہ کی ضرورت تھی، جس میں شیرِ بیشۂ حریت کو شہید کردیا جائے۔ مئی ۱۷۹۹ء اسی منصوبہ کی آخری تاریخ تھی، دن کا ایک بجا تھا کہ جنگ آزادی کے اس شیر دل کمانڈر نے اپنے مخصوص جاں نثاروں کے ساتھ انگریز حملہ آوروں کی مدافعت شروع کی، ہر طرف سے گھر جانے کے باوجود مئی کی دہکتی ہوئی گرمی میں بھوکے پیاسے سات گھنٹے کی جنگ کے بعد غروبِ آفتاب کے وقت اس بہادر سلطان نے خشک ہونٹوں کو جامِ شہادت سے تر کیا اور تاریخ جبر وقہر کی پیشانی پر خون شہادت سے یہ لکھ دیا:

''شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے''

''لارڈ ہارس'' نے جب سلطان کی خون آلود لاش دیکھی تو بے ساختہ اس نے یہ نعرہ بلند کیا۔ آج ہندوستان ہمارا ہے، اب آزادیٔ وطن کی اجڑی محفل میں صرف مرہٹی اقتدار کی ایک بجھی بجھی سی شمع باقی رہ گئی تھی؛ مگر وہ بھی تا بکے؛ چنانچہ آج ہندوستان کے نعرہ کی صداقت جتانے کے لیے ۱۸۰۰ء کے آخر میں لارڈ لیک انگریزی فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا، راجہ سندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی نگہبان تھیں، سینہ سپر ہوئیں؛ مگر انگریزی فوجوں کے ریلا کے آگے مرہٹوں کی قوتِ ایثار ثابت قدم نہ رہ سکی، مجبوراً لٹی پٹی دلی نے بادلِ ناخواستہ انگریزوں کا استقبال کیا اور لارڈ لیک نے دلی پر تسلط کر کے سلطنتِ مغلیہ کے تخت کے نام نہاد وارث ''شاہ عالم'' سے وہ مشہور معاہدہ کیا، جس کی تعبیر ان الفاظ میں کی گئی کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' یہی وہ موقع ہے جب ایک فقیر بے نوا یعنی سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنا انقلاب انگیز فتویٰ صادر فرمایا کہ ''ہندوستان اب دارالحرب ہے''؛ جس سے استخلاصِ وطن کی جہد وجنگ کا دورِ ثانی شروع ہوا۔

(باقی)

الفاظِ سلام کی تعریف وتنکیر
(لفظ سلام ال کے ساتھ اور ال کے بغیر)

از: مولانا محمد تبریز عالم قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

قرآن کریم کی متعدد آیات میں سلام کے دونوں صیغے: یعنی السلام الف لام کے ساتھ اور سلامٌ بغیر الف لام کے آئے ہیں؛ اِسی طرح احادیث میں اکثر و بیشتر مواضع میں لفظ سلام معرفہ آیا ہے، نکرہ بہت کم آیا ہے (سلام کے بارے میں صحیح تلفظ السلام علیکم ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی پر عمل پیرا تھے، سلامٌ علیکم کہنا درست ہے؛ البتہ یہ شیعوں کا شعار بتایا جاتا ہے؛ اس لیے سلامٌ علیکم کہنے سے احتراز کرنا چاہیے، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند: ۳۰۰۰۱)، اِسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ لفظِ سلام کی تعریف وتنکیر دونوں درست ہیں؛ لہٰذا سلامٌ علیکم اور السلام علیکم دونوں کہنا جائز ہے؛ لیکا لبتہ السلام علیکم کہنا افضل اور بہتر ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

ولو حذف اللام، فقال: سلامٌ عليكم أجزأ، قال اللّٰه تعالى: والملائكة يدخلون عليهم من كل باب سلام عليكم (الرعد:۲۳) وقال تعالى: فقل سلام عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة (الأنعام:٥٤) وقال تعالى: سلام على نوح في العالمين (الصافات:۷۹) إلى غير ذلك؛ لكن باللام أولىٰ؛ لأنها للتفخيم والتكثير وثبت في حديث التشهد السلام عليك أيها النبي. (فتح الباري:۱۳/۷)

یعنی الف لام کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے؛ لیکن الف لام کے ساتھ اولیٰ اور افضل ہے؛ کیوں کہ الف لام میں معنی کی زیادتی اور کثرت ہے، اِس صورت میں جنسیت واستغراق مراد ہوگا اور سلامتی کی ہر نوع اور جنس اِس دعا میں آجائے گی اور تشہُّد جو نماز میں مشروع ہے، اُس میں بھی الف لام کے ساتھ السلام علیك ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

لو نَوَّن المجرد من أل كما هو تحية الملائكة لأهل الجنة، يجب الرد؛ فيكون له صيغتان.

یعنی اگر کسی نے ال کے بغیر سلامٌ نکرہ استعمال کیا تو جواب دینا واجب ہے؛ کیوں کہ یہ فرشتوں کا، اہلِ جنت کو سلام کرنے کا طریقہ ہے؛ لہٰذا اسلام کے دو صیغے ہوئے۔ (ردالمحتار: ۵۹۶/۹)

السلام علیکم اور سلامٌ علیکم کا ایک فرق

آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں السلام علیکم کہنا مسنون ہے اور دنیا سے گذرنے کے بعد بغیر الف لام کے سلامٌ علیکم کا لفظ مسنون ہے، زیارتِ قبور کا جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے، وہ بھی سلامٌ علیکم بما صبرتم فنعم عقبى الدار آیا ہے اور فرشتے جب اہلِ جنت کا استقبال کریں گے اُس وقت بھی یہ لفظ اِسی عنوان سے آیا ہے، سلامٌ علیکم طبتم فادخلوها خالدين اور یہاں بھی اہل اَعراف اہلِ جنت کو اِسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔ (معارف القرآن: ۷۶۸/۳)

ایک غلط رواج

یاد رہے کہ سلام کے مسنون صیغے صرف دو ہیں: السلامُ علیکم (شروع میں الف لام اور میم پر پیش) اور سلامٌ علیکم (شروع میں الف لام کا حذف اور میم پر تنوین) اس کے علاوہ آپ جتنے صیغے، سلام کے بولیں، وہ سب غیر مسنون ہوں گے۔

آج خصوصاً عجم میں جہاں عربی اور عربی گرامر سے ناواقفیت عام ہے، یہ رواج عام ہے کہ لوگ السلامُ علیکم کی جگہ سَلَامْ علیکم کہتے ہیں یعنی سلام کے میم کو ساکن کر کے بولتے ہیں، درمختار میں ہے:

أنه لا يجب رَدُّ "سلامْ عليكم" بجزم الميم یعنی ایسے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے، اس کی شرح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

ثم رأيتُ في الظهيرية: ولفظ السلام في المواضع كلها: السلامُ عليكم أو سلامٌ عليكم بالتنوين وبدونِ هذين كما يقول الجُهّالُ، لا يكونُ سلاماً؛ لمخالفته

السنة التي جاءت بالتركيب العربي. (الدرمع الدر:۵۹۶/۹)

یعنی السلام علیکم یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے شروع میں الف لام اور اخیر میں پیش ہے، حدیث میں ایسے ہی وارد ہے، اب اگر یوں کہیں ''سلامْ علیکم'' میم کے سکون کے ساتھ تو اس صورت میں ایک تو شروع سے الف لام حذف ہوگئے، دوسرے جب اسم پر الف لام نہ ہو تو عموماً اُس کے اخیر میں تنوین آتی ہے، اور یہاں وہ بھی نہیں، تو یہ نہ صرف عربی قواعد کے خلاف ہے؛ بلکہ الفاظِ حدیث کے موافق بھی نہیں؛ لہٰذا یہ مسنون نہیں ہے؛ بلکہ بقول علامہ شامی: ایسے سلام کرنے والے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں، اور ایسا عموماً بے توجہی اور جلد بازی کی وجہ سے ہوتا ہے؛ اِس لیے اس پہلو پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، خود بھی السلام علیکم کہیں اور دوسروں کو بھی بتائیں۔

چند اور غلط صیغے: (۱) سَلَامْ لِیکُم (۲) سَلَامَا لِیکُم (۳) السلامٌ علیکم (۵) السام لیکم (٦) السام علیکم (۷) سام علیکم (۸) سام لیکم (۹) السلامْ عَلِیکُم (میم کا سکون اور علیکم میں لام کے زیر کے ساتھ) (۱۰) السلام أَلَیکم.

یہ سب سلام کے غلط اور غیر مسنون صیغے ہیں، جو ناواقفیت کی وجہ سے لوگ بول دیتے ہیں، علامہ شامی کا فیصلہ یاد رکھیں ولفظ السلام في المواضع كلها: السلامُ عليكم أو سلامٌ عليكم بالتنوين، وبدون هذين كما يقول الجهال، لا يكون سلاماً.

لفظ سلام ہر جگہ السلامُ علیکم یا سلامٌ علیکم ہے، اِن دونوں الفاظ کے علاوہ جتنے الفاظ ہیں، وہ سب مسنون سلام نہیں ہیں۔

سلام کے موقع پر ''علیک السلام'' کہنا

ابتدائے سلام میں نبی کریم ﷺ کے تعلیم کردہ الفاظ السلام علیکم یا السلام علیك ہیں، اور آپ ﷺ ابتداءِ سلام میں علیك السلام یا علیکم السلام کو ناپسند فرمایا کرتے تھے، حضرت جابر بن سُلیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو یوں سلام کیا، علیك السلامُ یا رسول اللّٰہ! (آپ نے جواب نہیں دیا) اور کہا: لا تَقُل: علیك السلام؛ فإن علیك السلام تحیة الموتی کہ علیك (شروع میں) مت کہا کرو، یہ تو مُردوں کا سلام ہے۔ (ابوداؤد، رقم:۵۲۰۹)

مسئلہ: سلام کا آغاز علیك السلام یا علیکم السلام کے ذریعہ مکروہ ہے۔ (عمدۃ القاری: ۳۴۶/۱۵)

مسئلہ: اِس طرح سلام کرنا مسنون طریقہ نہیں ہے؛ لہٰذا اِس کا جواب دینا ضروری نہیں؛ ورنہ حضور ﷺ پہلے جواب دیتے، پھر ادب سکھلاتے؛ لہٰذا اس کا سلام نہ ہونا راجح ہے۔ (ردالمحتار: ۵۹۶/۹)

لیکن علامہ عینی کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی نے آغاز ہی میں لاعلمی کی وجہ سے "علیکم السلام" کہہ دیا تو اگرچہ ایسا کرنا مکروہ ہے؛ لیکن اُسے جواب دے دینا چاہیے، اِس رائے کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، اور عدمِ جواز کی رائے کو "قیل" سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۳۴۶/۱۵)؛ چناں چہ ترمذی کی روایت میں حضور کا بعد میں جواب دینا ثابت ہے۔ (رقم الحدیث: ۲۷۲۱)

مسئلہ: اگر صورتِ مذکورہ میں کوئی واو کا اضافہ کرکے وعلیکم السلام کے ذریعہ سلام کرے تو جواب کا مستحق نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اِس لفظ میں، ابتداءً سلام بننے کی صلاحیت ہی نہیں؛ لہٰذا یہ سلام ہی نہیں ہے۔ (ردالمحتار: ۵۹۶/۹)

اس کی مزید تفصیل ''رموزِ سلام'' کے تحت آئے گی، ان شاء اللہ۔

سلام کے جواب میں علیک السلام یا علیکم السلام کہنا — ایک علمی بحث

السلام علیکم کا مسنون جواب وعلیکم السلام یا وعلیك السلام ہے؛ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے اور یہی لوگوں میں رائج ہے؛ لیکن فقہاء نے اِس موقع پر یہ بھی گفتگو کی ہے کہ اگر کسی نے، جواب میں بغیر واو کے علیکم السلام کہہ دیا تو یہ جوابِ سلام ہوگا یا نہیں؟ یہ ایک علمی بحث ہے، شائقینِ علم وفن کے لیے، سپردِ قرطاس کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں دو رائے ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ "علیکم السلام" بحذف الواو، سلام کا جواب نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس سے جوابِ سلام کا فریضہ ساقط ہوگا. اِس رائے کی بنیاد تین دلیلوں پر ہے: (۱) اِس طرح جواب دینا مسنون جوابِ سلام کے خلاف ہے (۲) ایسی صورت میں یہ معلوم نہ ہوسکے گا کہ علیکم السلام کہنے والے نے سلام کا جواب دیا ہے یا خود ہی سلام کیا ہے؛ کیوں کہ اس صیغے میں سلام اور جوابِ سلام: دونوں کی گنجائش ہے: (۳) تیسری دلیل وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إذا سلَّم علیکم أهل الکتاب، فقولوا: "وعلیکم" یعنی اہل کتاب تمہیں سلام کردیں تو جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا کرو (مسلم: ۲۱۶۳،

باب النهی عن ابتداء أهل الکتاب) طرزِ استدلال یوں ہے کہ حضور ﷺ نے جب اُن اہل کتاب کے سلام کے جواب میں ''وعلیکم'' (باثبات الواو) کہنے کا حکم دیا ہے جو کبھی السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت ہو) بھی کہہ دیا کرتے تھے، تو مسلمان کے سلام کے جواب میں تو وعلیکم السلام کہنا بدرجہ اولیٰ لازم اور ضروری ہوگا۔

دوسری رائے اِس سلسلے میں یہ ہے کہ جیسے وعلیکم السلام (واو کے ساتھ) صحیح ہے، ویسے ہی علیکم السلام (بلا واو) بھی درست ہے، دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَاماً قَالَ سَلَامٌ (الذاریات: ۲۴) قال سلام کا مطلب ہے سلامٌ علیکم، دیکھیے سلام کے جواب میں وَسَلام نہیں ہے؛ بلکہ صرف سلامٌ ہے، دوسری دلیل خلقِ آدم کا قصہ ہے، حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے کہا: السلام علیك ورحمة الله (بخاری: ۳۳۲۶، باب خلق آدم) دیکھیے یہاں واؤ نہیں ہے، تیسری یہ ہے کہ قرآن میں ہے وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (النساء: ۸۶) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ، جواب دینے والا دو باتوں کا مُکلَّف ہے: یا تو جواب بالمثل دے یا اُس سے اچھا جواب دے، پہلا عدل ہے اور دوسرا افضل، اب جواب دینے والے نے علیکم السلام کہہ دیا تو یہ جواب بالمثل اور عدل ہے؛ لہٰذا صحیح ہے (خلاصہ زاد المعاد: ۳۸۵/۲)

فیصلہ: علامہ ابن القیم نے ان دونوں رایوں کو ذکر کرنے کے بعد، یہ بحث ذکر کی ہے کہ یہودیوں کے سلام کے جواب میں احادیث میں وعلیکم ہے یا صرف علیکم ہے؟ روایتیں دونوں طرح کی ہیں، ابن القیم کا رجحان اِس جانب ہے کہ اثباتِ واو، والی روایتیں صواب اور احسن ہیں؛ غالباً اِس سے یہی ثابت کرنا ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہنا زیادہ بہتر اور سنت کے قریب ہے۔ (عمدۃ القاری: ۳۴۶/۱۵، نقلاً عن شرح النووی) تاہم جائز وعلیکم السلام بھی ہے؛ کیوں کہ ایسی بحث جب اہل کتاب کے جواب کے سلسلے میں کی جاسکتی ہے تو یہی حکم مسلمان کے سلام کے جواب کا بھی ہونا چاہیے۔

چند مسائل

۱- سلام کے جواب کا افضل اور اعلیٰ درجہ ''وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته''

ہے اور صرف "وعلیکم السلام" کہنا بھی جائز ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۴۶)

۲- کسی نے سلام کے جواب میں صرف "علیکم" کہا تو یہ سلام کا جواب نہیں سمجھا جائے گا۔ (حوالہ سابق)

۳- کسی نے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہا تو دونوں قول ہیں: جواب ہوجائے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ کافی نہیں ہوگا۔ (ایضا)

شریعت میں الفاظ بھی مقصود ہیں

حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں "علیك السلام" کہنے کی ممانعت آئی ہے؛ اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سلام میں الفاظِ منصوصہ مسنونہ کی پیروی ضروری ہے۔

اِس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظِ شرعیہ میں اپنی طرف سے اضافہ، کمی اور ردّو بدل جائز نہیں؛ بلکہ اِس میں نص کی اِتّباع ضروری ہے، بطور دلیل کچھ روایات پڑھیے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضور ﷺ نے فرمایا:

جب تم اپنی خواب گاہ میں آؤ تو اِس طرح وضو کرو، جس طرح نماز کے لیے کیا جاتا ہے، پھر اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ اور یہ دعا پڑھو:

اللّٰهم أسْلَمتُ وَجْهِي إليك، وفَوَّضتُ أَمْرِي إليك، وأَلْجأتُ ظَهْري إلَيك، رَغْبَةً ورَهْبَةً إلَيك، لا مَلْجَأَ ولا مَنْجىٰ مِنْكَ إلَّا إلَيكَ. آمَنْتُ بكتابك الذي أنْزَلتَ وبِنَبِيِّكَ الذي أرْسَلْتَ.

اگر تم اسی رات فوت ہوئے تو مسلمان ہوتے ہوئے فوت ہوگے؛ لہٰذا تم اِن کو اپنے آخری کلمات بناؤ، میں نے کہا: میں تو وَبِرَسُولك الذي أرسلتَ یاد کرتا ہوں (بخاری کی دوسری روایت میں ہے: کہ میں نے یہ کلمات رسول اللہ ﷺ کے سامنے دُہرائے، جب میں نے وَبِرَسُولك پڑھا) تو آپ نے فرمایا: نہیں، وبِنَبِيِّك الذي أرسلتَ پڑھو۔ (بخاری، رقم: ۵۹۵۲، الدعوات)

دیکھیے رسول اور نبی میں، عام علماء کے نزدیک ترادُف ہے یا بعض کے نزدیک رسول خاص ہے، یعنی معنی میں اعلیٰ ہے نبی سے؛ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء کو اِس طرح پڑھنے سے منع فرمادیا۔

حضرت نافع کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس چھینکا اور کہا: الحمد للّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ، تو ابن عمر نے کہا میں بھی الحمد للّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ کہہ سکتا ہوں؛ لیکن یہ طریقہ نہیں ہے (کہ الحمد للّٰہ کے ساتھ والسلام کو ملایا جائے) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اِس موقع پر یہ تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد للّٰہ علی کل حال کہیں۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۳۸)

اِن نُصوص سے یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ الفاظِ شرعیہ کی پیروی ضروری ہے، اِس کے اندر کمی بیشی جائز نہیں؛ لہٰذا سلام اور جوابِ سلام کے وہی الفاظ معتبر ہوں گے، جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں، اور اگر سلام کے الفاظ بالکلیہ ترک کردیئے جائیں اور اُن کی جگہ دوسرے الفاظ: عربی یا علاقائی زبانوں کے اختیار کیے جائیں تو وہ اسلامی تحیہ نہیں ہوگا، اسلامی سلام وہی ہے جو نبی کریم ﷺ کا بتایا ہوا ہے اور عربی میں ہے؛ ہاں اگر اسلامی سلام کے بعد، علاقائی کلماتِ ملاقات بولے جائیں، جیسا کہ بولا جاتا ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

اس حدیث (اس سے مراد وہ روایت ہے، جس میں ہے کہ حضرت جابر بن سُلیم نے ابتداء حضور ﷺ کو یوں سلام کیا تھا: علیك السلام یا رسول اللّٰہ! تو آپ نے منع فرمادیا تھا، (ابوداؤد، رقم: ۵۲۰۹) سے ایک اور بنیادی بات معلوم ہوئی، جس سے آج کل لوگ بڑی غفلت برتتے ہیں، وہ یہ کہ احادیث سے معنی، مفہوم اور روح تو مقصود ہے ہی؛ لیکن شریعت میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ بھی مقصود ہیں، دیکھیے ''السلام علیکم'' اور ''علیکم السلام'' دونوں کے معنی تو ایک ہی ہیں، یعنی تم پر سلامتی ہو؛ لیکن حضور اقدس ﷺ نے حضرت جابر بن سُلیم رضی اللہ عنہ کو پہلی ملاقات ہی میں اِس امر پر تنبیہ فرمائی کہ سلام کرنے کا سنت طریقہ اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ ''السلام علیکم'' کہو، ایسا کیوں کیا؟ اِس لیے کہ اس کے ذریعہ آپ نے امت کو یہ سبق دے دیا کہ ''شریعت'' اپنی مرضی سے راستہ بتا کر چلنے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ ''شریعت'' اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔

آج کل لوگوں کی زبانوں پر اکثر یہ رہتا ہے کہ شریعت کی روح دیکھنی چاہیے، ظاہر اور الفاظ کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے، معلوم نہیں لوگ الفاظ کے بغیر روح تک کیسے پہنچ جاتے ہیں، اُن کے پاس کون سی ایسی خوردبین ہے، جس میں اُن کو روح نظر آتی ہے؛ حالاں کہ شریعت میں روح کے

ساتھ ظاہر بھی مطلوب اور مقصود ہے، سلام ہی کو لے لیں کہ آپ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کے بجائے اردو میں یہ کہہ دیں ''سلامتی ہوتم پر'' دیکھیے معنی اور مفہوم تو اِس کے وہی ہیں جو ''السلام علیکم'' کے ہیں؛ لیکن وہ برکت، وہ نور اور اتباعِ سنت کا اجر وثواب، اِس میں حاصل نہیں ہوگا، جو ''السلام علیکم'' میں حاصل ہوتا ہے۔ (اصلاحی خطبات: ۱۸۶/۶)

وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ویکرہ تغییر صیغة السلام المشروعة هکذا بمثل قول بعضهم: "سلام من اللّٰه" فذلك بدعة منكرة. صیغہ سلام کی تبدیلی مکروہ ہے، مثلاً کچھ لوگوں کا سلام من اللّٰه کہنا بدعت اور منکر ہے۔ (الفقه الإسلامي ۲۶۸۵/۴)

مسنون سلام ''السلام علیکم'' سے ہی ادا ہوگا

آداب عرض یا اِسی قسم کے دوسرے الفاظ، شرعی اسلامی تحیہ کے قائم مقام نہیں ہوں گے، اور سنتِ سلام ادا نہ ہوگی۔ (کفایت المفتی: ۹۰/۹)

❁ ❁ ❁

گناہ — پریشانیوں کا سبب

از: مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی
ماہنامہ بینات، بنوری ٹاؤن، کراچی

آج ہر انسان پریشان ہے کسی کو جانی پریشانی ہے تو کسی کو مالی، کسی کو منصب کی پریشانی ہے تو کسی کو عزت و آبرو کی، امیر اپنی کوٹھی میں پریشان تو غریب جھونپڑی میں، کوئی روزگار اور حالات سے نالاں ہے تو کوئی عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے شاکی۔ تقریباً ہر آدمی کسی نہ کسی فکر، ٹینشن اور پریشانی میں مبتلا ہے۔

دلی سکون، قرار اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہر ایک اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے مطابق اپنی پریشانیوں کی از خود تشخیص کر کے ان کے علاج میں لگتا ہے۔ کوئی اقتدار، منصب یا عہدہ میں سکون تلاش کرتا ہے؛ مگر جب اُسے مطلوبہ منصب مل جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں تو سکون نام کی کوئی چیز ہی نہیں؛ بلکہ منصب کی ذمہ داریوں اور منصب کے زوال کے اندیشوں کی صورت میں اور زیادہ تفکرات ہیں۔

کسی نے سمجھا کہ سکون صرف مال و دولت کی کثرت و فراوانی میں ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ مال و دولت حاصل ہوا، اُن میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ کاروباری تفکرات، ترقی کا شوق، دن بدن بڑھتی ہوئی حرص اور تجارت میں نقصان کے اندیشوں سے اُن کی راتوں کی نیند حرام ہے، الا ماشاء اللہ۔ کسی نے رقص و سرود اور شراب و کباب کو باعثِ سکون جانا؛ مگر وقتی اور عارضی لذت کے بعد پھر بھی بے چینی اور اضطراب برقرار۔ کسی نے منشیات کا سہارا لیا؛ مگر اس میں بھی صرف عارضی دل بہلاوا، عارضی فائدہ اور دائمی نقصان۔ کسی نے نت نئے فیشن کر کے دل بہلانے کی کوشش کی؛ مگر سکون و قرار نہ ملا۔

جب کہ دینی ذہن رکھنے والوں کا یہ خیال ہے کہ مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچاؤ کا

اصل طریقہ اوراُن کا حقیقی علاج صرف ایک ہی ہے کہ اپنے آپ کو گناہگار، خطاکار، نافرمان اور قصوروار سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور گناہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیا جائے؛ کیونکہ سکون وراحت کے سب خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، وہی ان کا مالک ہے، جب مالک راضی ہوگا تو خوش ہوکر اپنی مملوکہ چیز (سکون وراحت) اپنے فرمانبردار بندوں کو عطا کرے گا اور وہ مالک راضی ہوتا ہے نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑنے اور فرمانبرداری اختیار کرنے سے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ ہر اچھے یا بُرے عمل کا ردعمل ضرور ہوتا ہے، دنیا میں پیش آنے والے حالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز انسان کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں جن کا براہِ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضی سے ہے۔ کسی واقعہ اور حادثہ کے طبعی اسباب جنہیں ہم دیکھتے، سُنتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ کسی اچھے یا برے واقعہ کے لیے محض ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں۔ سادہ لوح لوگ حوادث وآفات کو صرف طبعی اور ظاہری اسباب سے جوڑتے اور پھر اِسی اعتبار سے اُن حوادث سے بچاؤ کی تدابیر کرتے ہیں۔ شرعی تعلیمات کی روشنی میں بحیثیت مسلمان ہمیں یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور امر سے ہوتا ہے، جس کا عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ ادراک کرنے سے ہم قاصر ہیں، وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جزاء وسزا کا جو نظام سمجھایا ہے، وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، وہ یہ کہ کسی بھی واقعہ اور حادثہ کا اصل اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حالات کو (خواہ اچھے ہوں یا بُرے) انسانی اعمال سے جوڑا اور وابستہ فرمایا ہے، چنانچہ انسان کے نیک وبداعمال کی نوعیت کے اعتبار سے احوال مرتب ہوتے ہیں؛ صحت ومرض، نفع ونقصان، کامیابی وناکامی، خوشی وغمی، بارش وخشک سالی، مہنگائی وارزانی، بدامنی ودہشت گردی، وبائی امراض، زلزلہ، طوفان، سیلاب وغیرہ، یہ سب ہمارے نیک وبداعمال کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر: ان سب احوال کے ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں؛ مگر حقیقی اسباب ہمارے نیک وبداعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح کے خوفناک اور عبرت انگیز واقعات (خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''الارم'' اور ''تنبیہ'' ہوتے ہیں؛ تاکہ انسان اپنے اعمال کا محاسبہ کرے اور کوئی تنبیہ اس کے غفلت شعار دل کو جُنبش دینے میں کامیاب ہوجائے:

جب بھی میں کہتا ہوں: اے اللہ! میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

دُنیا میں پیش آمدہ اچھے یا بُرے واقعات سے حاصل ہونے والا انسانی تجربہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ بہت سارے لوگوں اور قوموں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے دُنیا میں ہی مختلف قسم کے عذاب آئے ہیں، مثلاً: کوئی مسخ کیا گیا، کوئی زمین میں دھنسایا گیا، کوئی دریا میں غرق کیا گیا، کوئی طوفان کی نذر ہوا۔ ان تباہ شدہ اقوام کی بستیوں کے کھنڈرات آج بھی اس حقیقت پر دال ہیں کہ نافرمانی سببِ پریشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور حضور ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں اعمال کی حسبِ نوعیت تاثیرات کو (جیسی کرنی ویسی بھرنی کے بہ مصداق) مختلف پہلوؤں اور طریقوں سے بیان فرمایا ہے، امت کو بدعملیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ فرما کر اعمال کی اصلاح کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ یہ مضمون قرآن کریم کی دسیوں آیات اور حضور ﷺ کی سیکڑوں احادیث سے صراحۃً ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱- "مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً". (النحل:۹۷)

ترجمہ: "جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطے کہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اُسے پاکیزہ (یعنی عمدہ) زندگی دیں گے"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نیکی پُرسکون زندگی کا سبب ہے؛ چنانچہ دو چیزوں (ایمان اور اعمال صالحہ) کے موجود ہونے پر اللہ تعالیٰ نے "حيٰوة طيبة" یعنی پرلطف اور پُرسکون زندگی عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ عام آدمی بھی یہ آیت پڑھ کر یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ نہ ہوں یا کوئی ایک نہ ہو تو "حيٰوة طيّبة" یعنی "پُرسکون زندگی" نصیب نہ ہوگی، بلکہ "پریشان زندگی" نصیب ہوگی۔

۲- "وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكاً وَّنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمىٰ". (طٰہٰ:۱۲۴)

ترجمہ: "اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے (دنیا اور آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا"۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہ کی؛ بلکہ نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا کی زندگی تنگ کردیں گے، ظاہری طور پر مال و دولت، منصب و عزت مل بھی جائے تو قلب میں سکون نہیں آنے دیں گے، اس طور پر کہ ہر وقت دنیا کی حرص، ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں

بے آرام رہے گا۔اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ’’نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے‘‘۔

۳- ’’ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ‘‘. (الروم:۴۱)

ترجمہ:’’خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب خرابی پھیل رہی ہے؛ تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھا دے؛ تاکہ وہ باز آجائیں‘‘۔

٤- ’’وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ‘‘. (الشوریٰ:۳۰)

ترجمہ:’’اورتم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سارے (گناہوں) سے تو وہ (اللہ تعالیٰ) درگزر کردیتا ہے‘‘۔

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ مصیبت اور فساد کا سبب خود انسان کے اپنے کیے ہوئے بُرے اعمال ہیں، اور یہ بھی بآسانی سمجھ میں آرہا ہے کہ: اگر بُرے اعمال نہ ہوں تو یہ مصائب، آفات اور فسادات وغیرہ بھی نہ ہوں گے۔نتیجہ یہی نکلا کہ ’’نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے‘‘۔

٥- ’’وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ‘‘. (الاعراف:۹۶)

ترجمہ:’’اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے؛ لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا‘‘۔

یعنی ایمان اور تقویٰ (اعمالِ صالحہ) برکت وخوشحالی کا ذریعہ اور بُرے اعمال عذاب وپکڑ اور پریشانی کا سبب ہیں۔

٦- ’’وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ‘‘. (ہود:۵۲)

ترجمہ:’’اوراے میری قوم! تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ اور اس کے سامنے توبہ کرو، وہ تم پر خوب بارش برسائے گا اور تم کو قوّت دے کر تمہاری قوّت میں زیادتی کرے گا اور

مجرم رہ کر اعراض مت کرو‘‘۔

۷- ”فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا“. (نوح:۱۲)

ترجمہ: ’’تو میں نے کہا کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بے شک وہ بخشنے والا ہے، تم پر آسمان کی دھاریں (تیز بارشیں) برسائے گا اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا تمہارے لیے نہریں‘‘۔

ان دونوں آیات میں نعمتوں اور برکات کے حصول کا طریقہ گناہوں سے توبہ، استغفار اور تقویٰ کو بیان فرمایا ہے، جب معلوم ہوا کہ گناہوں کا چھوڑنا اور توبہ کرنا مال واولاد کی کثرت اور خوشحالی کا سبب ہے تو اس سے لازمی طور صاحبِ عقل وشعور یہی نتیجہ نکالے گا کہ ’’گناہ اور نافرمانی، نعمتوں میں کمی اور بدحالی کا سبب ہے‘‘۔

۸- ”وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ“. (الطلاق:۲،۳)

ترجمہ: ’’اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا‘‘۔

اس آیت میں تقویٰ کو نجات اور وسعتِ رزق کا سبب بتایا ہے اور اس کا عکس یہی ہے کہ نافرمانی اور گناہ، پریشانیوں میں گرفتار ہونے اور قلتِ رزق اور نعمت میں کمی کا سبب ہے۔

۹- ”وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ“. (النحل:۱۱۲)

ترجمہ: ’’اور بتائی اللہ نے ایک بستی کی مثال جو چین وامن سے تھے، چلی آتی تھی اس کی روزی فراغت سے ہر جگہ سے، پھر ناشکری کی اللہ کی نعمتوں کی، پھر مزہ چکھایا اس کو اللہ نے بھوک اور خوف کے لباس کا‘‘۔

اگر غور کیا جائے تو یہ آیت درحقیقت ایک آئینہ ہے، جس میں ہر بستی اور ہر ملک والے اپنی حالت دیکھ اور جانچ سکتے ہیں۔ جس کی حالت اس بستی کی طرح ہے، وہ سمجھ لے کہ اُس سے غلطی بھی اُنھیں کی طرح ہوئی ہے۔ اپنے ملک کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کے ترجمہ کو دوبارہ پڑھیں اور غور کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ ہم میں اور ان بستی والوں میں کوئی فرق

نہیں ہے۔اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اسلامی ملک پاکستان کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان نے جو غیر اسلامی سلوک روا رکھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہے، جس کے نتیجہ میں ہم پر آج برے حالات مسلط ہیں۔ہمارے وطن کے من جملہ بڑے مسائل میں سے دو مسئلے بہت خطرناک اور انتہائی پریشان کن ہیں۔(۱) مہنگائی۔(۲) بدامنی اور دہشت گردی۔اس آیت میں بھی ناشکری کی دو سزائیں مذکور ہیں، ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری اور اُس کی نافرمانی کی ہے؛ اس لیے ہم ان حالات کا شکار ہیں۔بہرحال قرآن مجید کی یہ آیت ٹھیک ٹھیک ہمارے حالات پر چسپاں ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

بہت سی احادیث بھی صراحۃً اسی مضمون ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون'' پر دلالت کرتی ہیں۔''مشتے نمونہ از خروارے'' یہاں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس وقت کیا ہوگا؟ جب پانچ چیزیں تم میں پیدا ہوجائیں گی اور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں پیدا ہوں یا تم ان (پانچ چیزوں) کو پاؤ، (وہ یہ ہیں):

۱- بے حیائی: جسے کسی قوم میں علانیہ (ظاہراً) کیا جاتا ہو تو اس میں طاعون اور وہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو ان سے پہلوؤں میں نہیں تھیں۔

۲- اور جو قوم زکوٰۃ سے رک جاتی ہے تو وہ (درحقیقت) آسمان سے ہونے والی بارش کو روکتی ہے اور اگر جانور نہ ہوتے تو ان پر بارش برستی ہی نہیں۔

۳- اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو وہ قحط سالی، رزق کی تنگی اور بادشاہوں کے ظلم میں گرفتار ہوجاتی ہے۔

۴- اور امراء جب اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلے کرتے ہیں تو ان پر دشمن مسلط ہوجاتا ہے جو ان سے ان کی بعض چیزوں کو چھین لیتا ہے۔

۵- اور جب اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں جھگڑے پیدا کردیتا ہے''۔(الترغیب، ج:۳،ص:۱۶۹)

مذکورہ حدیث میں مختلف گناہوں کو مختلف آفات و پریشانیوں کا سبب بتایا گیا ہے، اس قدر صراحت کے بعد بھی کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ ''نافرمانی سببِ پریشانی اور باعثِ عذاب ہے''؟۔

ایک اور روایت میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"عبادَ اللّٰہ! لَتُسَوُّنَّ صفوفَکم أو لیخالفَنَّ اللّٰہُ بین وجوھکم". (مشکوٰۃ، ص:۹۷)

ترجمہ: "اے اللہ کے بندو! تم اپنی صفوں کو درست کرلو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں (یعنی دلوں) میں اختلاف پیدا کردے گا"۔

مذکورہ حدیث میں صفوں کو سیدھا نہ کرنے کے فعل بد پر (جو ہے بھی بظاہر چھوٹا گناہ) آپس میں اختلافات پیدا ہونے کی وعید ہے، اس سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ بُرے اعمال سبب پریشانی ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ:

"أعمالکم عمالکم وکما تکونوا یولی علیکم". (کشف الخفاء ج:۱، ص:۱۴۷، بحوالہ طبرانی)

ترجمہ: "تمہارے اعمال ہی (درحقیقت) تمہارے حاکم ہیں اور جیسے تم ہوگے ایسے ہی حاکم تم پر مسلّط ہوں گے"۔

یہ حدیث بھی اعمالِ بد کے برے نتائج برآمد ہونے پر دلالت کرتی ہے؛ چنانچہ برے اور ظالم حکمران بھی اعمالِ بد کی وجہ سے مسلط ہوتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں ذکر کردیا جائے، جو مذکورہ مسئلہ پر دلالت کرتا ہے: "حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک دفعہ مدینہ اور حجاز کے علاقہ میں زبردست قحط پڑا، حضرت عمرؓ نے مصر وشام کے علاقہ سے کثیر مقدار میں غذائی اشیا منگوائیں؛ مگر قحط کسی طور پر کم نہ ہوا، ایک صحابی بلال بن حارث مزنیؓ کو خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی، حضور ﷺ نے فرمایا: میں تو سمجھتا تھا کہ عمرؓ سمجھدار آدمی ہے! اس صحابیؓ نے حضرت عمرؓ کو خواب سنایا، حضرت عمرؓ بہت پریشان ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور ﷺ کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: نہیں اور حضرت عمرؓ کی کچھ تعریف کی۔ حضرت عمرؓ نے خواب دیکھنے والے صحابیؓ کو فرمایا کہ اپنا خواب بیان کریں۔ خواب سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ اس جانب متوجہ فرمارہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لیے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرمارہے ہیں؛ لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نمازِ استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمرؓ چونکہ حق قبول کرنے کا مزاج رکھتے تھے تو آپؓ نے نمازِ استسقاء ادا

فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۷، ص:۲۰۳، ۲۰۴)

اس واقعہ پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ اچھے اعمال کا اثر بھی اچھا اور بُرے اعمال کا اثر بھی بُرا ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں نمازِ استسقاء کا اثر اچھا ہوا۔ اور اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسائل صرف ظاہری اسباب سے حل نہیں ہوتے؛ بلکہ ان کے لیے باطنی اسباب بھی ضروری ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو یہ تردّد اور اشکال ہو کہ عجیب بات ہے، پریشانی دنیوی ہے اور مشورہ دینوی اسباب کے بجائے گناہوں اور نافرمانیوں کے چھوڑنے کا دیا جارہا ہے، یعنی بظاہر ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے گناہوں کو پریشانی اور نیکی کو راحت واطمینان کا سبب قرار دے دیا تو ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ عقل میں آئے یا نہ آئے، بلاتردُّد ''آمَنَّا وَصَدَّقْنَا'' کہے اور بزبانِ حال یوں گویا ہو کہ:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کیونکہ جس ذات پر ایمان لائے ہیں، اس کا یہی فرمان ہے، اس لیے ماننے کے سوا چارۂ کار نہیں۔

دوسرا جواب عقلی لحاظ سے یہ ہے کہ مال و دولت، عزت ومنصب، صحت وتندرستی، راحت وسکون وغیرہ، یعنی دنیا کی ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے، جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے تو پھر سوچئے کہ کیا مالک (اللہ تعالیٰ) جس کے دربار میں نہ ہی چوری ممکن ہے اور نہ زبردستی سفارش، اس کو راضی کیے بغیر کچھ لیا جاسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے ہی پریشانیوں سے چھٹکارا اور راحت وسکون مل سکتا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں: بعض اوقات نیک وصالح، دین دار، حتیٰ کہ بزرگ حضرات بھی مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں؛ حالانکہ وہ گناہوں سے بھی بچ رہے ہوتے ہیں، فرمانبرداری بھی کررہے ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے یعنی اکثر پریشانیاں گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے آتی ہیں؛ مگر بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو بہ طورِ آزمائش ہوتی ہیں اور نتیجتاً نعمت کے حصول کا سبب بنتی ہیں، وہ اس طرح کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کو کسی خاص اخروی درجہ اور مرتبہ پر فائز کرنا چاہتے ہیں؛ مگر وہ اپنی بشری کمزوری کی وجہ سے نیکیوں کی بنیاد پر

اُس کا مستحق نہیں بن سکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کے مرتبہ کو مزید بڑھانے اور اونچا کرنے کے لیے دنیا کے اندر آزمائش (بیماری، پریشانی وغیرہ) میں مبتلا کردیتے ہیں تو یہ مصیبت درحقیقت مصیبت نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کی نعمت ہوتی ہے جو نتیجتاً رفعِ درجات کا سبب بنتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی تکالیف اور آزمائشیں اسی قبیل سے ہیں، ان کی مثال اُس محنت کی طرح ہے جو کسی نعمت کے حصول میں کرنی پڑتی ہے، جیسے شہد کے حصول میں بعض اوقات شہد کی مکھی کے ڈنک سہنے پڑتے ہیں، تو اس طرح کی پریشانیاں دراصل شہد کی مکھی کے اُن ڈنکوں کی طرح ہیں جو بالآخر شہد جیسی نعمت کے حصول پر منتج ہوتے ہیں۔

اس شبہ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس نیک بندے سے بشری کمزوری کی بنا پر کبھی کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جو بڑے رحیم وکریم ہیں، اپنے خاص بندے کے اس گناہ کو دنیا ہی میں دھونے کے لیے اُسے مصیبت میں مبتلا کردیتے ہیں؛ تاکہ وہ آخرت کی بڑی رُسوائی اور بڑے عذاب سے بچ جائے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک صورت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کرسکتا۔

ان دو جوابات کا حاصل یہ ہے کہ انسان پر آنے والی پریشانی دو قسم کی ہوتی ہے: ایک پریشانی وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوتا ہے، جو اخروی عذاب کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اصل دارالجزاء تو آخرت ہے، دنیا دارالعمل ہے؛ مگر کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اخروی عذاب کا ایک ادنیٰ سا نمونہ دنیا میں بھی دکھا دیتا ہے؛ تاکہ انسان نافرمانی سے باز آجائے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ". (السجدۃ:۲۱)

ترجمہ: ''اور ہم ضرور ان کو قریب کا چھوٹا عذاب چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے، تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

اور پریشانی کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں ہوتی؛ بلکہ اس کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے جو رفع درجات یا گناہوں کے مٹنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور یہ پریشانی اور تکلیف درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہوتی ہے کہ اس چھوٹی سے تکلیف کے سبب اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندے کو آخرت کے بڑے عذاب سے بچا لیتے ہیں یا رفع درجات کی صورت میں آخرت کی بڑی نعمت عطا فرمادیتے ہیں حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

"أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل".

ترجمہ: "سب سے زیادہ آزمائش انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے، پھر جو اُن کے جس قدر زیادہ مشابہ ہوں۔"

یعنی انبیاء علیہم السلام پر زیادہ آزمائشیں آئیں اور پھر جس کا جس قدر اُن سے زیادہ تعلق ہوگا، زیادہ قرب ہوگا، زیادہ اتباع ہوگی، اس پر بھی آزمائشیں زیادہ آئیں گی؛ مگر خدانخواستہ انبیاء علیہم السلام پر آنے والی یہ تکالیف اور آزمائشیں کوئی سزا نہیں تھیں؛ بلکہ ان کے درجات کو مزید بلند کرنا مقصد تھا۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ نافرمان لوگ جو مال دار ہیں، بظاہر خوش نظر آتے ہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ مالداری ایک نعمت ہے اور خوشی اور آرام کا ظاہری سبب ہے؛ مگر ضروری نہیں کہ جو مال دار ہو، وہ خوشحال اور پرسکون بھی ہو؛ کیونکہ بعض لوگوں کے پاس بہ ظاہر مال و دولت اور سامانِ عیش وعشرت تو ہوتا ہے؛ مگر ان کا دل قناعت وتوکل سے خالی ہونے کی بنا پر ہر وقت دنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر، اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، ذرا اُن سے پوچھ کر تو دیکھیے کہ وہ راحت وآرام کے سارے اسباب اپنے پاس رکھنے کے باوجود سکونِ دل کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ ہاں! اگر کوئی ایک آدھ فرد ایسا مل جائے جو نافرمان ہونے کے باوجود بھی خوش ہو تو وہ شاذ ونادر مثال ہوگی اور شاذ ونادر کا اعتبار نہیں ہوتا، حکم اکثریت پر لگتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ نافرمانوں کی اکثریت پریشان ہی رہتی ہے۔ دراصل قلبی سکون اور حقیقی اطمینان مال سے حاصل ہونے والی چیز ہی نہیں ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے ذکر سے ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: "أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" یعنی "خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے"۔ مگر ہم میں سے اکثر لوگ چونکہ ذکر اللہ کی لذت سے بالکل کورے ہیں؛ اس لیے ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا، دراصل ہم نے اس وادی میں قدم ہی نہیں رکھا، بقولِ شاعر:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مذکورہ اعتراض کا یہ جواب بھی ہے کہ جو نافرمان بہ ظاہر خوشحال ہیں، انھیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے، جو چند روزہ ہے، یہ چند روزہ خوشحالی لمبی پریشانی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

جس خوشحالی کا انجام چند روز کے بعد دائمی تباہی ہو، اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے؟ جیسے چوہا زہر ملی ہوئی چیز کھا کر خوش ہوتا ہے؛ مگر اس میں اس کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

اصل نکتہ کی بات یہ ہے کہ سکون وراحت کا تعلّق صرف جسم سے نہیں ہے؛ بلکہ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی ان کا تقاضہ کرتی ہے، مادی وسائل اور راحت وسکون کے ظاہری اسباب جسم کو تو آرام دے سکتے ہیں؛ مگر روح کو قرار اور دل کو سکون بخشنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ روح کی تسکین اور اس کی غذا عبادت اور ذکر اللہ ہیں؛ کیونکہ انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ کسی لافانی ذات کی بندگی کرے، اس فطری خواہش کی تسکین مادہ پرست زندگی کے اسباب ووسائل سے پوری نہیں ہوسکتی، روح کی تسکین کے لیے روحانی اسباب (اعمال صالحہ جیسے ذکر اللہ اور عبادت وغیرہ) کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایک بزرگ نے یہی بات کیا ہی خوب صورت انداز میں بیان فرمائی ہے:

''یہ خدا ناآشنا زندگی کا لازمی خاصّہ ہے کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں، اس بے قراری کا ایک کرب انگیز پہلو یہ ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نامعلوم اضطرار اور پراسرار کسک محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ اضطراب کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ وہ نہیں جانتے''۔

خلاصہ یہ کہ ہم پر جو پریشانیاں اور مصیبتیں آتی ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں، لہٰذا پُرسکون اور پُرلطف زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے ان پر معافی مانگیں، فی الفور نافرمانی چھوڑ کر آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کریں۔ واللّٰہ الموفّق والمعین .

❁ ❁ ❁

اسلام میں وصیت کا قانون

از: مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی

وصیت کیا ہے

وصیت میت کے اس حکم کو کہتے ہیں جس پر موت کے بعد عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص انتقال کے وقت یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد میری جائداد میں سے اتنا مال یا اتنی زمین فلاں شخص یا فلاں دینی ادارہ یا مسافر خانہ یا یتیم خانہ کو دے دی جائے تو یہ وصیت کہلاتی ہے۔ وصیت کو دو گواہوں کی موجودگی میں تحریر کرنا چاہیے تاکہ بعد میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔ شریعت اسلامیہ میں وصیت کا قانون بنایا گیا ہے؛ تاکہ قانون میراث کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں حصہ نہیں پہنچ رہا ہے اور وہ مدد کے مستحق ہیں، مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت زدہ ہے یا کوئی بھائی یا بہن یا کوئی دوسرا عزیز سہارے کا محتاج ہے تو وصیت کے ذریعہ اس شخص کی مدد کی جائے۔ وصیت کرنا اور نہ کرنا دونوں اگرچہ جائز ہیں لیکن بعض اوقات میں وصیت کرنا افضل و بہتر ہے۔ ایک تہائی جائیداد میں وصیت کا نافذ کرنا وارثوں پر واجب ہے، یعنی مثلاً اگر کسی شخص کے کفن دفن کے اخراجات، دیگر واجبی حقوق اور قرض کی ادائیگی کے بعد ۹ لاکھ روپے کی جائیداد بچتی ہے تو ۳ لاکھ تک وصیت نافذ کرنا وارثین کے لیے ضروری ہے۔ ایک تہائی سے زیادہ وصیت نافذ کرنے اور نہ کرنے میں وارثین کو اختیار ہے۔ کسی وارث یا تمام وارثین کو محروم کرنے کے لیے اگر کوئی شخص وصیت کرے تو یہ گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے وارث کو میراث سے محروم کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جنت سے محروم رکھے گا (کچھ عرصہ کے لیے)۔ (ابن ماجہ و بیہقی) انتقال کے بعد ترکہ (جائداد یا رقم) کی تقسیم صرف اور صرف وراثت کے قانون کے اعتبار سے ہوگی۔

ابتداء اسلام میں جب تک میراث کے حصے مقرر نہیں ہوئے تھے، ہر شخص پر لازم تھا کہ اپنے وارثوں کے حصے بذریعہ وصیت مقرر کرے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں

اور نہ کسی حق دار کا حق مارا جائے۔ لیکن جب بعد میں تقسیم وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود اصول وضوابط بنادئے جن کا ذکر سورۃ النساء میں ہے تو پھر وصیت کا وجوب ختم ہوگیا، البتہ دو بنیادی شرائط کے ساتھ اس کا استحباب باقی رہا۔ ا) جو شخص وراثت میں متعین حصہ پا رہا ہے اس کے لیے وصیت نہیں کی جاسکتی ہے، مثلاً ماں، باپ، بیوی، شوہر اور اولاد۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابۂ کرام کے مجمع کے سامنے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کا حصہ مقرر کردیا ہے، لہٰذا اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔'' (ترمذی۔ باب ما جاء لا وصیۃ لوارث) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مزید وضاحت موجود ہے کہ میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کردیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں ہے، اُن کے لیے حکم وصیت اب بھی باقی ہے۔) وصیت کا نفاذ زیادہ سے زیادہ ترکہ کے ایک تہائی حصہ پر نافذ ہوسکتا ہے الا یہ کہ تمام ورثاء پوری وصیت کے نفاذ پر راضی ہوں۔

امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، اب ان کے لیے بھی وصیت کرنا فرض ولازم نہیں ہے، کیونکہ فرضیت وصیت کا حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ (تفسیر جصاص، تفسیر قرطبی) یعنی بشرطِ ضرورت وصیت کرنا مستحب ہے۔

وصیت کی مشروعیت قرآن کریم سے

(۱) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے، وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے۔ یہ متقی لوگوں کے ذمہ ایک لازمی حق ہے۔۔۔ پھر جو شخص اس وصیت کو سننے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اس میں تبدیلی کریں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا جانتا ہے۔۔۔ ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا ارتکاب کررہا ہے اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (سورۃ البقرہ ۱۸۰۔۱۸۲) وصیت کا لازم اور فرض ہونا، یہ حکم اُس زمانہ میں دیا گیا تھا جب کہ وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کا حکم بتدریج نازل فرمایا۔ غرضے کہ مذکورہ بالا آیت میں وصیت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا ہے؛ البتہ استحباب باقی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں جہاں وارثوں کے متعین حصے ذکر فرمائے ہیں، متعدد

مرتبہ اس قانون کو ذکر فرمایا: ''یہ ساری تقسیم اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی جو مرنے والے نے کی ہے، یا اگر اس کے ذمہ کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد''۔ سورۃ النساء میں متعدد مرتبہ وصیت کے ذکر سے وصیت کی مشروعیت روز روشن کی طرح واضح ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اے ایمان والو! جب تم میں سے کوئی مرنے کے قریب ہو تو وصیت کرتے وقت آپس کے معاملات طے کرنے کے لیے گواہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ تم میں سے دو دیانت دار آدمی ہوں (جو تمہاری وصیت کے گواہ بنیں) یا اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو، اور وہیں تمہیں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیروں (یعنی غیر مسلموں) میں سے دو شخص ہو جائیں۔'' (سورۃ المائدہ ۱۰۶) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضر کے ساتھ سفر میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے اور وصیت کرتے وقت دو امانت دار شخص کو گواہ بھی بنالیا کرو؛ تاکہ بعد میں کسی طرح کا کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔

وصیت کی مشروعیت حدیث نبوی سے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جس کے پاس وصیت کے قابل کوئی بھی چیز ہو، درست نہیں کہ دو رات بھی وصیت کو لکھ کر اپنے پاس محفوظ کئے بغیر گزار دے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الوصیہ) (صحیح مسلم۔ کتاب الوصایا۔ باب الوصایا) قرآن وحدیث کی روشنی میں علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کے ذمہ قرضہ ہو یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو یا اس کے ذمہ کوئی واجب ہو جسے وہ خود ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے وصیت میں یہ تفصیل لکھ کر رکھنا ضروری ہے، عام آدمی کے لیے وصیت لکھنا ضروری نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے۔

وصیت کی مشروعیت اجماع امت سے

قرآن وحدیث کی روشنی میں پوری امت مسلمہ کا وصیت کے جواز پر اجماع ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہؒ نے اپنی مشہور کتاب (المغنی ج ۸۔ص ۳۹۰) میں وصیت کے جواز پر اجماع امت کا ذکر کیا ہے۔

وصیت کی حکمتیں

وصیت کی متعدد حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کے انتقال کے بعد وراثت قرابت کی بنیاد پر تقسیم ہوتی ہے نہ کہ ضرورت کے پیش نظر، یعنی جو میت سے جتنا زیادہ قریب ہوگا

اس کو زیادہ حصہ ملے گا خواہ دوسرے رشتہ دار زیادہ غریب ہی کیوں نہ ہوں۔لیکن شریعت اسلامیہ نے انسان کو یہ ترغیب دی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو مدد کا زیادہ مستحق سمجھتا ہے اور اس کو میراث میں حصہ نہیں مل رہا ہے تو اس کے لیے اپنے ایک تہائی مال تک وصیت کر جائے۔مثلاً کسی شخص کے کسی بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے اور پوتا پوتی حیات ہیں تو انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی جائداد میں سے ایک تہائی مال تک اپنے یتیم پوتے اور پوتی کو وصیت کر جائے۔اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

وصیت کی اقسام: واجب وصیت

(۱) اگر کسی شخص کا قرضہ ہے تو اس کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۲) اگر زندگی میں حج فرض کی ادائیگی نہیں کر سکا تو اس کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۳) اگر زکوٰۃ فرض تھی، ادا نہیں کی تو اس کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۴) اگر روزے نہیں رکھ سکا اس کے بدلہ میں صدقہ ادا کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۵) اگر کوئی قریبی رشتہ وصیت کے قانون کے مطابق میراث میں حصہ نہیں حاصل کر پا رہا ہے، مثلاً یتیم پوتا اور پوتی اور انھیں شدید ضرورت بھی ہے تو وصیت کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن اسے اپنے پوتے کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔بعض علماء نے ایسی صورت میں وصیت کرنے کو واجب بھی کہا ہے۔

مستحب وصیت

شریعت اسلامیہ نے ہر شخص کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے ایک تہائی کی کسی بھی ضرورت مند شخص یا مسجد یا مدرسہ یا مسافر خانہ یا یتیم خانہ کو وصیت کر جائے؛ تاکہ وہ اس کے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے اور اس کو مرنے کے بعد بھی اس کا ثواب ملتا رہے۔

مکروہ وصیت

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں اس وقت مکہ مکرمہ میں تھا (حجۃ الوداع یا فتح مکہ کے موقعہ پر)۔حضور اکرم ﷺ اُس سرزمین پر موت کو پسند نہیں فرماتے تھے جہاں سے کوئی ہجرت کر چکا ہو۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابن عفراء (سعد) پر رحم فرمائے۔میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں اپنے سارے مال و دولت کی وصیت (اللہ کے راستے میں) کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔میں

نے پوچھا پھر آدھے کی کردوں؟ آپ ﷺ نے اس پر بھی فرمایا کہ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر تہائی مال کی کردوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تہائی مال کی کرسکتے ہو، اور یہ بھی بہت ہے۔ اگر تم اپنے رشتہ داروں کو اپنے پیچھے مالدار چھوڑو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں محتاج چھوڑ دو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اس میں کوئی شبہ نہ رکھو کہ جب بھی تم کوئی چیز جائز طریقہ پر خرچ کروگے تو وہ صدقہ ہوگا۔ وہ لقمہ بھی جو تم اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دوگے (وہ بھی صدقہ ہے) اور (ابھی وصیت کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں) ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں شفا دے اور اس کے بعد تم سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہو اور دوسرے بہت سے لوگ (اسلام کے مخالف) نقصان اٹھائیں۔ (بخاری۔ کتاب الوصایا) (ترمذی۔ باب ما جاء فی الوصیہ بالثلث) غرضے کہ اگر اولاد و دیگر وارثین مال وجائداد کے زیادہ مستحق ہیں تو پھر دوسرے حضرات اور اداروں کے لیے وصیت کرنا مکروہ ہے۔

وضاحت: حضور اکرم ﷺ کی شفا کی دعا کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تقریباً پچاس سال تک حیات رہے اور انہوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ہی ۱۷ ہجری میں کوفہ شہر بسایا تھا جو بعد میں علم وعمل کا گہوارہ بنا۔ آپ ہی کی قیادت میں ایران جیسی سوپر پاور کو فتح کیا گیا۔ آپ نے ہی دریا دجلہ میں اپنے گھوڑے ڈال دیے تھے، علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے: دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحرِ ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے۔

ناجائز وصیت

ایک تہائی سے زیادہ جائداد کی وصیت کرنا۔ وارث کے لیے وصیت کرنا۔ اس نوعیت کی وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ اولاد یا کسی دوسرے وارث کو اپنی جائداد سے محروم کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص یا دینی ادارہ کو وصیت کرنا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کئی لوگ (ایسے بھی ہیں جو) ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری میں زندگی گزارتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں وارثوں کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان پر جہنم واجب ہوجاتی ہے۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ آیت (سورۃ النساء ۱۲) پڑھی: ''جو وصیت کی گئی ہو اس پر عمل کرنے کے بعد اور مرنے والے کے ذمہ جو قرض ہو اس کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ (وصیت اور قرض کے اقرار کرنے سے) اس نے کسی کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یہ سب کچھ اللہ کا حکم ہے، اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا، بردبار ہے۔'' (ترمذی باب

جار فی الوصیۃ بالثلث)

وصیت سے متعلق چند مسائل

(۱) کوئی بھی شخص اپنی صحت مند زندگی میں کسی بھی اولاد کی تعلیم ،اس کے مکان کی تعمیر وغیرہ پر کم یا زیادہ رقم خرچ کرسکتا ہے،اسی طرح عام صحت مند زندگی میں اولاد کے درمیان جائداد کی تقسیم کچھ کم یا زیادہ کے ساتھ کرسکتا ہے، تاہم اس کو چاہیے کہ حتی الامکان اولاد کے مصارف اور جائداد کو دینے میں برابری کرے۔ عام صحت مند زندگی میں وصیت یا وراثت کا قانون نافذ نہیں ہوتا۔ عام صحت مند زندگی میں اولاد و دیگر رشتہ داروں کو دی جانے والی رقم یا جائداد ہبہ کہلاتی ہے۔ غرضیکہ عام صحت مند زندگی میں باپ اپنی اولاد میں سے اگر کسی کو مالی اعتبار سے کمزور محسوس کررہا ہے یا اپنے یتیم پوتا یا پوتی کو اپنی طرف سے مخصوص رقم یا جائداد کا کچھ حصہ دینا چاہتا ہے تو دے سکتا ہے۔

(۲) ام المؤمنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت سوائے اپنے سفید خچر، اپنے ہتھیار اور اپنی زمین کے جسے آپ نے صدقہ کردیا تھا، نہ کوئی درہم چھوڑا تھا نہ دینار، نہ غلام نہ باندی اور نہ کوئی اور چیز۔ (بخاری کتاب الوصایا) غرضے کہ آپ ﷺ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا، اسی وجہ سے ترکہ کے تعلق سے آپ ﷺ کی کوئی وصیت موجود نہیں ہے۔

(۳) قرض کو وصیت پر مقدم کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے قرض وصیت سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیا ہے، (یعنی انسان کے ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کے بعد سب سے پہلے قرض کی ادائیگی کی جائے گی، پھر وصیت نافذ ہوگی)؛ جب کہ تم لوگ قرآن کریم میں وصیت کو پہلے اور قرض کو بعد میں پڑھتے ہو۔ (ترمذی باب ما جاء یبدا بالدین قبل الوصیۃ) مذکورہ بالا ودیگر احادیث کی روشنی میں پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرض کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہے۔

(۴) شرعاً وارث کو وصیت نہیں کی جاسکتی ہے، لیکن اگر کسی شخص نے وارثین میں سے کسی وارث کو وصیت کردی اور تمام ورثاء میت کے انتقال کے بعد اس کی وصیت پر عمل کرنے کی اجازت دے رہے ہیں تو وہ وصیت نافذ ہوجائے گی۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کردی اور تمام ورثاء میت کے انتقال کے بعد اس کی وصیت پر عمل کرنے کی اجازت دے رہے ہیں تو وہ وصیت نافذ ہوجائے گی۔

(۵) تحریر کردہ وصیت نامہ میں تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے، یعنی اگر کسی شخص نے کوئی وصیت تحریر کر کے اپنے پاس رکھ لی، پھر اپنی زندگی میں ہی اس میں تبدیلی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

ایک اہم نقطہ

جس طرح ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد اس کا مال صحیح طریقہ سے اولاد اور دیگر وارثین تک پہنچ جائے اور اولاد اس کے مال کو صحیح طریقہ سے استعمال کرے اور اس میں مزید اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اسی طرح ہمیں اس بات کی بھی فکر وکوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہماری اولاد کیسے اللہ کے احکام و نبی اکرم ﷺ کے طریقہ کے مطابق زندگی گزارے گی؟ تاکہ وہ مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیش والی زندگی میں کامیاب ہوسکیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے لیے ان کی وصیت کا ذکر فرمایا ہے: اور اسی بات کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب نے بھی (اپنے بیٹوں کو) کہ: ''اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دین تمہارے لیے منتخب فرمالیا ہے، لہٰذا تمہیں موت بھی آئے تو اس حالت میں آئے کہ تم مسلم ہو۔ کیا اُس وقت تم خود موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا، جب انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اُن سب نے کہا تھا کہ ہم اُسی ایک خدا کی عبادت کریں گے، جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (سورۃ البقرۃ ۱۳۲ و ۱۳۳)

دوسرا اہم نقطہ

جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تجربات سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی کے آخری وقت میں بہت اہم اور ضروری بات ہی کرتا ہے۔ آپ ﷺ کے داماد اور چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا آخری کلام تھا: (نماز، نماز اور غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو)۔ (ابوداود، مسند احمد) ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت یہ ارشاد فرمائی: نماز، نماز۔ اپنے غلاموں (اور ماتحت لوگوں) کے بارے میں اللہ سے ڈرو، یعنی ان کے حقوق ادا کرو۔ جس وقت آپ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے پورے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ (مسند احمد) اس سے ہم نماز کی اہمیت وتاکید کا اندازہ لگاسکتے ہیں کہ محسن انسانیت ﷺ نے آخری وصیت نماز کی پابندی کے متعلق کی، لہٰذا ہمیں پوری زندگی نماز کا اہتمام کرنا چاہیے۔

سلطان ٹیپوؒ اور مذہبی رواداریاں

(م۱۲۱۳ھ=۱۷۹۹ء)

از: معاذ کولہاپوری
جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

سرزمینِ ہند کی پرامن فضاؤں میں آزاد نہ سانس لیتے ہوئے دورِ فرنگی کا تذکرہ چھڑتا رہتا ہے، اور مجاہدینِ وطن وشہدائے چمن کی قربانیوں کی یاد دہانیوں اور مدح سرائیوں کی مجلسیں جمتی رہتی ہیں۔ یہ مجلسیں اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتیں؛ جب تک کہ ٹیپوسلطانؒ کا تذکرہ نہ ہو۔

یہ سچ ہے کہ سلطانؒ جنگِ آزادی کے سرخیل تھے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ان میں موجود تھیں جن سے لوگ ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ سلطانؒ کو ایک متعصب اور ہندو دشمن ظالم حکمراں کی حیثیت سے پیش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں؛ حالانکہ حقیقت بالکل برعکس ہے۔ غلط فہمیاں تو انگریز مؤرخین نے من گھڑت اور جھوٹی باتیں لکھ کر پھیلائی تھیں۔ ان کے جھوٹ کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک مثال کافی ہوگی: ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ: ٹیپوسلطانؒ نے صرف ''کورگ'' شہر میں ستر ہزار لوگوں کو قبولِ اسلام پر مجبور کیا تھا؛ حالانکہ عہدِ ٹیپو میں سرزمینِ ''کورگ'' فقط پچیس سے تیس ہزار کی آبادی پر مشتمل تھی۔ (سیرت ٹیپوسلطان شہید ص۴۳۲)

مندروں پر عنایات

ٹیپوسلطانؒ نے مسجدوں اور مندروں کے درمیان کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا، جس طرح مسجدوں پر سلطانؒ کی نظریں رہیں، اسی طرح مندروں پر بھی ان کی عنایات رہیں، جن کا اندازہ درج ذیل چند مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے:

تعلقۂ ننجن گڑھ کے کلالے نامی گاؤں میں واقع لکشمی کانتھ مندر میں چاندی کے چار

پیالے، ایک پلیٹ اور ایک اگالدان اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، جو ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اس مندر کو بطور نذرانہ دیا تھا۔

خود سری رنگا پٹنم کے رنگناتھ مندر کو سلطانؒ نے ایک کافوردان اور چاندی کے سات پیالے دیے تھے اور یہ چیزیں آج تک اس مندر میں موجود ہیں۔ مقدم الذکر شہر کے ایک اور مندر سر کینشور کو ایک مرصع پیالہ۔ جس کے نچلے حصے میں پانچ قیمتی جوہرات جڑے ہوئے تھے۔ عطا کیا اور نارائن سوامی مندر کو قیمتی جواہرات سے آراستہ بہت سے برتن، ایک نقارہ اور بارہ ہاتھی عنایت کیے تھے۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۳۸)

مندروں کی حفاظت

سلطانؒ مندروں پر فقط خزانے لٹا کر عہدہ برآ نہ ہوئے؛ بلکہ مشکل اوقات میں کئی مندروں کی حفاظت بھی کی ہے۔ ڈنڈیگل تعلقہ پر حملہ کرتے ہوئے سلطانؒ نے اس کے عقبی حصہ سے گولہ باری کروائی تھی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ راجہ کا وہ مندر حملوں کی زد میں نہ آنے پائے جو قلعہ کے اگلے حصہ میں واقع تھا۔

ملیبار میں گروایوار پر قبضہ کے دوران وہاں کے ایک مندر کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کرنے والے کچھ مسلمان سپاہیوں کو سلطانؒ نے سزائیں بھی دلوائیں اور اسی وقت مندر کی مرمت بھی کروائی۔

کانجی ورم کے اُس مندر کی تکمیل کے لیے (جس کی بنا ۱۷۸۰ء میں سلطان حیدر علی نے رکھی تھی؛ مگر تکمیل نہ ہوسکی تھی) سلطان نے دس ہزار روپیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس موقع پر ہونے والی آتش بازیوں کے مصارف بھی خود برداشت کیے تھے۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۳۸)

مندروں اور سوامیوں کا احترام

جب رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں مرہٹہ دراندازوں اور فتنہ پردازوں نے سرنگیر کے ایک مندر پر حملہ کیا، بیش قیمت املاک لوٹ کر لے گئے اور سارہ دیوی نامی مورتی کو باہر پھینک دیا جس کے نتیجہ میں مندر کے سوامی اور متولی شنکر گرواچاریہ فرار ہوکر شہر کارکل میں پناہ گزیں ہوئے اور سلطان سے حالات کی شکایت کی، تو سلطانؒ نے جواباً ایک خط سوامی کے نام ارسال کیا جس

میں آپؒ نے اس قدر احترام کے ساتھ سوامی کو تسلی دی کہ خلافِ معمول گروجی کے نام کو اپنے نام پر مقدم کیا اور اسی پر بس نہیں؛ بلکہ ان کو اپنے زیر قبضہ دیہاتوں میں سے کسی بھی چیز کے لینے کا اختیار دیا، نیز اس علاقہ کے گورنر سے دوسو اشرفیاں مع غلہ دالوئیں اور سارہ دیوی کو احترام کے ساتھ اس کی جگہ نصب کروا کر اس تقریب کے موقع پر ایک ہزار فقرا کو کھانا کھلوایا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۳۵)

ہندو عہدیدار بڑے عہدوں پر

سلطانؒ ہندوؤں کو فقط دور ہی سے نوازتے نہیں رہے؛ بلکہ انھیں بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز کر رکھا تھا۔ سلطنتِ خداداد کا وزیرِ خزانہ ہندو برہمن ''پورنیا'' تھا۔ یہی ''پورنیا'' باعتبار اختیارات کے وزیراعظم میر صادق کے بعد سلطانؒ کا نائبِ دوم بھی تھا۔

سلطان کا ذاتی منشی اور معتمدِ خاص ''لالہ مہتاب رائے سبقت'' نامی ایک ہندو برہمن تھا، جو میدانِ جنگ میں بھی شاہی کیمپ میں رہتا تھا اور اخیر تک سلطانؒ کا وفادار رہا۔

میسور کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ہری سنگھ تھا، جس کا بھائی بھی باوجود ہندو ہونے کے حکومت کا ایک بڑا عہدیدار تھا۔ کورگ کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ایک برہمن تھا۔ علاوہ ازیں تین ہزار کی ایک فوج سردار سیواجی کی کمان میں رہتی تھی۔ اسی طرح اور بھی کئی مناصبِ علیا پر غیر مسلموں کو فائز کر رکھا تھا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۳۴)

ہندو اور مسلم کے حقوق میں مساوات

سلطان ٹیپوؒ نے جس طرح عبادت گاہوں میں برابری اور مساوات کا معاملہ کیا، اسی طرح انسانی حقوق میں بھی بلاتفریق ہندو و مسلم کے مذہبی رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ جہاں انہوں نے کرشنا راؤ اور اس کے بھائیوں کو غداری کی سزا میں تختۂ دار پر لٹکایا، وہیں محمد قاسم اور عثمان خان کشمیری کو بھی موت کے گھاٹ اتارا۔ جہاں سلطانؒ نے عیسائی غداروں اور نمک حراموں کے پیشوا اور قائدین کو موت کی سزا دی، وہیں ان مسلمان عورتوں کو بھی قتل کیا جنھوں نے انگریز سپاہیوں کے ساتھ بدکاری کی تھی۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۳۳)

اہل السنۃ والجماعۃ سے عقائد میں بنیادی فرق کی بنا پر مہدوی فرقہ کو سلطانؒ غیر مسلم ہی گمان

کرتے تھے، نیز یہ لوگ سلطنتِ خداداد کے لیے آستین کے سانپ تھے، ان میں سے بھی بہتیرے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کررکھا تھا۔ جب ان کی انگریزوں کی خفیہ حمایت پر ایک مدت دراز گذر گئی اور ذکر بالجہر کا وہ خاص غیر شرعی طریقہ۔ جس کے یہ لوگ قائل تھے۔ پوری پوری رات اڑوس پڑوس کے لوگوں کی تکلیف کا باعث بننے لگا، اور برملا حکم عدولیاں کرنے لگے، تو سلطانؒ نے ان کو جلاوطن کردیا۔

عیسائیوں کے ساتھ سلطان کا سلوک

عیسائیوں کے ساتھ بھی سلطانؒ کا رویہ کچھ مختلف نہ تھا۔ سلطان نے کئی فرانسیسی عیسائیوں کو اپنی سلطنت میں عہدے سپرد کررکھے تھے۔ آرمینیہ کے عیسائی تاجروں کو بھی اپنے ملک میں آکر تجارت کرنے کی اجازت ہی نہیں؛ بلکہ ان کی مالی پشت پناہی بھی کی۔ گُوا سے تارکینِ وطن عیسائیوں کو دوبارہ اپنی سلطنت میں لاکر بسایا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۴۵)

رعایا کے دل میں سلطانؒ کی عقیدت ومحبت

رعایا میں سلطان ٹیپو کی عقیدت اس قدر تھی کہ ہندو مذہب کے دو فرقوں واڈ گلائی اور ٹنکا لائی کے درمیان اختلاف ہونے پر خود ہندوؤں نے سلطان کو اپنا حَکَم اور ثالث بنایا تھا۔ بھلا اگر سلطانؒ ظالم اور ہندو دشمن ہوتے تو یہ صورتِ حال کیوں کر ممکن ہوتی؟

سلطانؒ کی مذہبی رواداری ہی تو تھی جس نے رعایا کے سینوں میں عقیدت ومحبت کے وہ شمع فروزاں کیے تھے جنہیں دیکھ کر انگریز بھی ششدر تھے۔ سلطانؒ نے جس جگہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اسی جگہ سلطانؒ کے سیکڑوں فدائین کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، جن میں عورتیں بھی تھیں اور جوان لڑکیاں بھی۔ جب سلطان کا جنازہ اٹھایا جانے لگا تو راہ میں ہندو عورتیں ماتم کرتے ہوئے اپنے سروں پر مٹی ڈال رہی تھیں۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید ص ۴۴۳)

اسی لیے ظفر علی خان نے کہا تھا:

قوتِ بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود

سلطانؒ کی مذہبی رواداری اور بلاتفریق مذہب رعایا سے حسنِ سلوک ملاحظہ فرمائیں اور

دوسری طرف ہندوفرقہ پرستوں کے منہ سے نکلا ہوا زہر دیکھیے، تاریخ کے مسخ کرنے اور اسے مٹانے کی زندہ مثال آپ کو واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ جولوگ تحمل مزاجی اور برداشت کی دولت سے محروم ہیں، اور جو تعصب کے ناپاک نالے کے گندے کیڑے ہیں، جو سانپ وبچھو کی طرح ہمیشہ زہر اگلتے رہتے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں کہ سلطان ہندوکُش اور متعصب ظالم حکمران تھا۔ کاش ایک نظر اپنے دامن پر بھی ڈال دی ہوتی!

ع دامن تو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

افسوس اس پر بھی ہے کہ سرزمین ہند کے اس عظیم سپوت کے حالاتِ زندگی اور اس کے قابلِ رشک کارنامے باشندگانِ ملک تک صحیح معنوں میں پہنچائے نہیں گئے ہیں، ورنہ ممکن نہ تھا کہ سلطانؒ کو متعصب اور ہندودشمن ظالم حکمران کہا جاتا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری، غیرمسلموں کی خوشی وغم میں شریک ہونے اور ان کے مذہبی جذبات کا خیال رکھنے میں سلطانؒ اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ بعض مواقع پر فقہی اعتبار سے اس پر بحث بھی کی جاسکتی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ خود مسلمانانِ ہند اپنے سلاطین وحکمرانوں کے کارناموں اور ان کی عدل پروری کی داستانوں سے ناواقف ہیں۔ اگر ٹیپوسلطان کے مسئلہ میں سنجیدگی اختیار نہ کی گئی اور اسے پڑھا اور پڑھایا نہ گیا تو وہ دن دور نہیں جب ٹیپوسلطانؒ جیسا عادل حکمران بھی ظالم سمجھا جانے لگے گا اور مسلمانانِ ہند وکیلِ صفائی بن کر وضاحتیں دے رہے ہونگے؛ لیکن اس وقت تک پانی سر سے اوپر ہوچکا ہوگا!

❁ ❁ ❁

خیر الکلام فی کشف أوهام الأعلام

(۱۰)

از: مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم، لندن

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے

❁ "صحیح بخاری" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: بینا أنا علیٰ بئرٍ أُنزِعُ منها، إذ جاءنی أبوبکرٍ وعمرُ، فأخذ أبوبکرٍ الدَّلوَ، فنزع ذَنُوبًا أو ذَنوبَیْنِ، وفی نزعِه ضعفٌ، فغفر اللّٰہُ له، ثم أخذها ابنُ الخطابِ مِنْ یدِ أبی بکرٍ، فاسْتَحالتْ فی یده غَرْبا، فلم أر عَبْقَرِیًّا مِن الناسِ یَفْرِی فَرِیَّهُ حتّی ضربَ الناسُ بِعَطَنٍ. (صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب نزع الماء من البئر حتی یروی الناس، ص:۱۰۳۹، ج:۲، قدیمی: کراچی)

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(میں نے خواب میں دیکھا) اس دوران کہ میں ایک کنویں پر تھا، اس سے پانی نکال رہا تھا کہ میرے پاس ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) آئے، ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے ڈول لیا، انھوں نے ایک یا دو ڈول کھینچے، ان کے کھینچنے میں ضعف تھا، اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائیں، پھر اس ڈول کو ابن الخطاب نے ابوبکر (رضی اللہ عنہما) کے ہاتھ سے لیا، تو وہ ان کے ہاتھ میں بہت بڑے ڈول میں تبدیل ہوگیا: بہت بڑا ڈول بن گیا، میں نے لوگوں میں سے کسی ماہر کو نہیں دیکھا، جو ان کے جیسا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیتا ہو، یہاں تک کہ لوگ اونٹوں کو ہانک کر بٹھانے کی جگہ میں لے گئے۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ عینی، علامہ قسطلانی، علامہ محمد تاودی رحمہم اللہ اور "الکنز المتواری" کے جامع فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا: ثم أخذها ابن الخطاب مِن یدِ أبی بکر.

’’پھر اس ڈول کو ابن الخطاب نے ابوبکر (رضی اللہ عنہما) کے ہاتھ سے لیا۔‘‘ ایسی بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نبی ﷺ سے ڈول لینے میں مذکور نہیں ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ انھوں نے ڈول میرے ہاتھ سے لیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عمر، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کی وصیت سے خلافت کی باگ ڈور سنبھالیں گے، بخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہ ان کی خلافت رسول اللہ ﷺ کی صریح وصیت سے نہ ہوگی؛ اگرچہ ان کی خلافت کے سلسلے میں آپ ﷺ نے کئی اشارات فرمائے، جو صراحت کے قریب تھے۔

"فتح الباری" لابن حجر العسقلانی میں ہے:

قول: "ثم أخذها ابن الخطاب من يد أبی بكر" كذا هنا، ولم يذكر مثله فی أخذ أبی بكر الدلو من النبی ﷺ، ففيه إشارة إلىٰ أن عمر ولی الخلافةَ بعهد من أبی بكر إليه، بخلاف أبی بكر فلم تكن خلافته بعهد صريح من النبی ﷺ؛ ولكن وقعت عدّة إشارات إلىٰ ذلك فيها ما يقرب من الصريح. (فتح الباری، ص:٤٣٠، ج:١٢، دارالريان: القاهرة)

"عمدة القاری" للعينی میں ہے:

قوله: "ثم أخذها ابن الخطاب" أی ثم أخذ الدلو عمر بن الخطاب رضی اللّٰه تعالىٰ عنه.

قوله: "من يد أبی بكر رضی اللّٰه تعالىٰ عنه" فيه إشارة إلى أن عمرولی الخلافة بعهد من أبی بكر، بخلاف أبی بكر فإن خلافته لم تكن بعهد صريح من النبی ﷺ؛ ولكن وقعت عدة إشارات إلىٰ ذلك فيها ما يقرب من الصريح. (عمدة القاری، ص:١٥٦، ج:٢٤؟ دار إحياء التراث العربی: بيروت)

"إرشاد الساری" للقسطلانی میں ہے:

(ثم أخذها) أی الدلوَ **(عمرُ بنُ الخطّابِ مِن يدِ أبی بكر)** فی قوله: مِن يدِ أبی بكر إشارةٌ إلىٰ أن عمرَ يلي الخلافةَ مِن أبی بكر بعهد منه، بخلاف أبی بكر فلم تكن خلافتُه بِعهدٍ صريحٍ منه ﷺ؛ ولهذا لَم يقلُ: مِن يدی، نعم وقعت عِدَّةُ إشاراتٍ إلىٰ ذلك فيها ما يقرب من الصريح. (إرشاد الساری، ص:٤٥٨، ج:١٤، العلمية: بيروت)

"حاشية التاودی بن سودة علی صحيح البخاری" میں ہے:

(**ثم أخذها ابن الخطاب من يد أبی بكر**) هكذا هنا، ولم يذكر مثله فی أخذ أبی بكر الدلو من يد النبی ﷺ، ففيه إشارة إلى أن عمر ولی الخلافة بعهد من أبی بكر، بخلاف أبی بكر فلم يكن بعهد صريح من النبی ﷺ؛ ولكن وقعت إشارات إلى ذلك تقرب من الصريح. (حاشية التاودی بن سودة علی صحيح البخاری، ص: ۳۳۱، ۳۳۲، ج:٦، العلمية، بيروت)

ہمارے دیار کی مطبوعہ "صحیح بخاری" کے نسخوں کے حاشیے میں یہ بات قسطلانی کے حوالے سے مذکور ہے؛ لیکن قدیمی: کراچی کے نسخے میں کتابت کی غلطی سے ما يقرب من الصريح کی بجائے ولم يقرب إلى الصريح ہوگیا ہے۔ ملاحظہ ہو: حاشیہ: ۱۲، ص: ۱۰۳۹، ج: ۲ اسی حاشیہ کے حوالے سے کتابت کی مذکورہ غلطی کے ساتھ یہ کلام "الكنز المتواری" میں منقول ہے:

قال الجامع:

قال الإمام محمد قاسم فی الحاشية: **قوله: "من يد أبی بكر"** إشارة إلى أن عمر يلی الخلافة من أبی بكر بعهد منه، بخلاف أبی بكر فلم تكن خلافته بعهد صريح منه ﷺ ولذا لم يقل: "من يدی" نعم وقعت عدة إشارات إلى ذلك فيها ولم يقرب إلى الصريح. (الكنز المتواری، ص: ١٢٤، ج:٢٣، مؤسسة الخليل الإسلامية: فيصل آباد)

بندہ کہتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ سے ڈول لیا، ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لیا؛ چناں چہ "صحیح بخاری" کتاب التعبیر ہی میں مذکورہ باب: باب نزع الماء من البئر حتى يروى الناس کے بعد ایک باب چھوڑ کر واقع باب: باب الاستراحة فی المنام میں هَمّام عن أبی هريرة کی روایت میں یہ بات صراحتاً وارد ہے:

قال رسولُ اللّٰه ﷺ: بينا أنا نائمٌ رأيتُ أنّی علىٰ حوضٍ أسقی الناس، فأتانی أبوبكر، فأخذ الدلوَ مِن يَدی ليُرِيحَنی، فَنزعَ ذَنوبَين، وفی نزعِه ضعفٌ، واللّٰهُ يَغفِر له،

فأتی ابنُ الخطاب، فأخذ منه، فلم یَزَلْ یَنْزِع حتّی تَولّی الناسُ والحوضُ یَتَفَجَّرُ. (صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب الاستراحة فی المنام، ص:۱۰۴۰، ج:۲، قدیمی: کراچی)

ملحوظہ:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "باب الاستراحة فی المنام" **کے تحت** هَمّام عن ابی هریرة رضی الله عنه **کی مذکورہ روایت کی تشریح کے موقع پر** "مِن یدی" **کے بغیر** "فأخذ أبوبکر الدلوَ لیُرِیحَنی" **کے الفاظ نقل فرمائے ہیں۔** "فتح الباری، ص:۴۳۳، ج:۱۲، دارالریان: القاهرة) **اور** "باب نزع الماء من البئر حتی یروی الناس" **کے تحت روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی تشریح کے دوران بھی** همّام عن أبی هریرة **کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے** "مِن یدی" **کے الفاظ تو نقل نہیں کیے؛ مگر** "مِنّی" **کا لفظ ذکر فرمایا ہے:**

ووقع فی روایة همام الآتیة بعد هذا "فأخذ أبوبکر مِنّی الدلوَ لیریحنی". (فتح الباری، ص:۴۳۰، ج:۱۲، دارالریان: القاهرة)

واللّٰه تعالیٰ أعلم وعلمه أتم وأحکم

یہ حدیث تو کتاب التمنی میں ہے، کتاب الفتن میں نہیں

❁ "صحیح بخاری" **میں ہے:**

حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قال: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ هَمَّامٍ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ رضی اللّٰه عنه عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَوْ كَانَ عِنْدِي أُحُدٌ ذَهَبًا لَأُحِبُّ أَنْ لاَ يَأْتِيَ (عَلَيَّ) ثَلٰثٌ وَعِنْدِي مِنْهُ دِينَارٌ لَيْسَ شَيْءٌ أَرْصُدُهُ فِي دَيْنٍ عَلَيَّ أَجِدُ مَنْ يَقْبَلُهُ. (صحیح بخاری، کتاب التمنی، باب تمنی الخیر الخ، ص:۱۰۷۳، ص:۱۰۷۳، ج:۲، قدیمی: کراچی)

''.....نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اگر اُحد پہاڑ سونے کا ہونے کی حالت میں میرے پاس (میری مِلک میں) ہوتا، تو میں پسند کرتا کہ (مجھ پر) تین راتیں اس حال میں نہ گذریں کہ اس میں سے ایک ایسا بھی دینار رہے، جس کو میرے دَین کی ادائیگی کے علاوہ روکے رکھتا، دراں حالے کہ میں اس کو قبول کرنے والا شخص پاؤں۔''

بالفاظِ دیگر: **''اگر اُحد پہاڑ سونے کا ہونے کی حالت میں میری مِلک میں ہوتا، تو میں یہ پسند نہ کرتا کہ (مجھ پر) تین راتیں گزرنے کے بعد ایک ایسا بھی دینار رہے، جو وفائے دَین کے**

علاوہ کے لیے روکے رکھوں، دراں حالے کہ میں اس کو قبول کرنے والا شخص پاؤں۔''

بندہ کہتا ہے:

شیخ عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ (وفات:۱۱۴۳ھ) نے "ذخائر المواریث فی الدلالة علیٰ مواضع الحدیث" میں اسحاق بن نصر کی مذکورہ روایت کی تخریج کو "صحیح بخاری" کتاب الفتن کی طرف منسوب کیا ہے، ملاحظہ ہو: ذخائر المواریث، ص:۱۳۳، ج:٤، دارالمعرفة: بیروت. یہ موصوف کا وہم ہے؛ کیوں کہ یہ روایت کتاب الفتن میں نہیں ہے؛ بل کہ کتاب التمنی، باب تمنی الخیر وقول النبی ﷺ: لو کان لی أحُدٌ ذهباً میں ہے۔

روایت میں "الوادی" بمعنیٰ "مکہ مکرمہ" یا "جنگلات"؟

☆ "صحیح مسلم" میں ہے:

عَنْ عَامِرِ بْنِ وَاثِلَةَ رضی اللّٰه عنه أَنَّ نَافِعَ بْنَ عَبْدِ الْحَارِثِ لَقِيَ عُمَرَ بِعُسْفَانَ، وَكَانَ عُمَرُ يَسْتَعْمِلُهُ عَلَى مَكَّةَ، فَقَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْتَ عَلَىٰ أَهْلِ الْوَادِي؟ فَقَالَ: ابْنَ أَبْزَى، قَالَ (فقال): وَمَنِ ابْنُ أَبْزَى؟ قَالَ: مَوْلًى مِنْ مَوَالِينَا، قَالَ: فَاسْتَخْلَفْتَ عَلَيْهِمْ مَوْلًى؟ قَالَ: إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَإِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ، قَالَ عُمَرُ: أَمَا إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ.

(صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه الخ، ص:۲۷۲، ج:۱، قدیمی: کراچی)

''حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ نافع بن عبدالحارث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عُسفان میں ملے، دراں حالے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مکہ مکرمہ کا حاکم بنا رکھا تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (دریافت) فرمایا: آپ نے مکہ والوں پر کس کو (اپنی نیابت میں) حاکم بنایا ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ابن اَبْزٰی کو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن ابزٰی کون ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک غلام ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ نے ان پر ایک آزاد شدہ غلام کو (اپنا) نائب بنایا؟ عرض کیا: وہ اللہ عزوجل کی کتاب کا پڑھنے والا اور فرائض کا جاننے والا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سنو! تمہارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: بلا شبہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی بدولت بہت سے لوگوں کو بلند (مرتبہ) کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو پست کرتے ہیں۔''

اس روایت میں جولفظ 'الوادی'' وارد ہے، اس سے مراد "مكة المكرمة" ہے۔ دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو ''وادی'' کہا جاتا ہے اور مکۃ المکرّمۃ کو بھی دو پہاڑوں: جبل ابی قُبیس اور جبل قُعَیْقِعان، کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے ''الوادی'' کہا گیا ہے۔

"فضائل اعمال" میں وہم واقع ہوا ہے اور ''مکہ والوں پر حاکم'' کی بجائے ''جنگلات کا ناظم''، یعنی ''الوادی'' بمعنی ''جنگلات'' لکھا گیا ہے؛ چناں چہ ''فضائل اعمال'' میں ہے:

''عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبدالحارث کو مکہ مکرمہ کا حاکم بنا رکھا تھا، ان سے ایک دفعہ دریافت فرمایا کہ جنگلات کا ناظم کس کو مقرر کر رکھا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ابن اَبْزٰی کو....'' (فضائل اعمال، ص:۲۱۸، فضائل قرآن، ص:۱۸، روایت:۷، زمزم پبلشرز: کراچی)

یہی روایت "المصنف لعبد الرزاق" میں ہے، اس میں "اهل الوادی" کی تفسیر "اهل مكة" سے کی گئی ہے۔ مکمل روایت حسب ذیل ہے:

أخبرنا عبدالرزاق عن معمر عن الزهری قال: أخبرنی عمرو (عامر) بن واثلة أن نافع بن عبد الحارث تلقی عمر بن الخطاب إلیٰ عُسفان، فقال له عمر: من استخلفت علیٰ أهل الوادی؟ – عینی أهل مكة – قال: ابن أبزی، قال: من ابن أبزی؟ قال: رجل من موالی، قال: استخلفت علیهم مولیً؟ قال: إنه قارئ لكتاب اللّٰه، قال: أما إن نبیكم صلی اللّٰه علیه وسلم قال: إن اللّٰه یرفع بهذا القرآن أقواما ویضع به آخرین. (المصنف لعبد الرزاق، باب التلقی، ص:٤٣٩، ج:١١، المجلس العلمی: ڈابھیل)

"مسند أبی یعلی'' کی روایت میں صراحتاً عبدالرحمٰن بن اَبْزٰی کے مکہ مکرمہ والوں پر نائب بنانے کا ذکر ہے، اس میں "أهل الوادی" کا لفظ سرے سے ہے ہی نہیں؛ چناں چہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

..... عن الحسنبن مسلم أن عمر بن الخطاب استعمل ابنَ عبد الحارث علیٰ أهل مكة، فقدم عمر، فاستقبله نافع بن عبدالحارث، استخلف علیٰ أهل مكة عبدالرحمن بن أبزٰی، فغضب عمر حتی قام فی الغرز، فقال: أتستخلف علیٰ آل اللّٰه عبدَالرحمن بن أبزٰی؟ فقال: إنّی وجدته أقرأهم لكتاب اللّٰه وأفقههم فی دین اللّٰه، فتواضع لها عمر حتّی اطمأنّ علی رحله، فقال: لئن قلتَ ذاك لقد سمعتُ رسول اللّٰه

ﷺ يقول: إن الله سَيَرُفع فهذا الدين أقواما ويضع به آخرين. (مسند أبی يعلی، مسند عمر بن الخطاب، حديث: ٢٠٥، ص: ١١١، ج: ١، العلميةء بيروت)

واضح ہو کہ ''صحیح بخاری'' وغیرہ میں ایک روایت ہے، جس میں اُمیّۃ بن خَلَف کا ابوجہل کے متعلق "سيّد أهلِ الوادی" **کہنا اور ابوجہل کا امیۃ بن خَلف کو** "إنك من أشراف الوادی" **یا** "أنت سيّد أهل الوادی" **کہنا مذکور ہے (ملاحظہ ہو:** صحيح بخاری، كتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام، ص:٥١٣، ج:١، **نیز** كتاب المغازی، باب ذكر النبی ﷺ من يقتل ببدر، ص:٥٦٣، ج:٢، قديمی: كراچی) **اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اسلام کے سلسلے میں** "صحيح بخاری" **وغیرہ میں منقول روایت میں ان کا اپنے بھائی کو** "اركبُ إلی هذا الوادی'' **کہنا مذکور ہے۔ (ملاحظہ ہو:** صحيح بخاری، كتاب المناقب، باب إسلام أبی ذر، ص:٥٤٤، ج:١) **ان مقامات میں بھی** "الوادی" **کا لفظ ''مکہ مکرمہ'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔**

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث اپنی ''مُسند'' میں تخریج فرمائی ہے

علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ (۸۳۱-۹۰۲ھ) حديث: "مَا رآهُ المسلمونَ حَسَنًا، فَهُوَ عِنُدَ اللهِ حَسَنٌ'' **کے متعلق** "المقاصد الحسنة فی بيان كثير من الأحاديث المشتهرة علی الألسنة" **میں فرماتے ہیں کہ:**

''امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تخریج "كتاب السنة" **میں فرمائی ہے اور جس نے اسے** "مُسنَد'' **کی طرف منسوب کیا، اس کو وہم ہو گیا ہے۔''**

پھر علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے أبو وائل عن ابن مسعود رضی الله عنه **کے طریق سے پوری حدیث نقل فرمائی ہے:**

حديث: "مَا رآهُ المسلمونَ حَسَنًا، فَهُوَ عِنُدَ اللهِ حَسَنٌ".

أحمد فی كتاب السنة، ووهِم من عزاه للمسند، من حديث أبی وائل، عن ابن مسعود، قال: إن اللّٰه نظر فی قلوب العباد، فاختيار محمدًا ﷺ، فبعثه برسالته، ثم نظر فی قلوب العباد، فاختار له أصحابًا، فجعلهم أنصار دينه و وزراء نبيه، فما رآه المسلمون حسنا، فهو عند اللّٰه حسن، وما رآه المسلمون قبيحا، فهو عند اللّٰه قبيح. وهو موقوف حسن. (المقاصد الحسنة، حديث: ٩٥٩، ص: ٤٣١، دارالكتاب العربی: بيروت)

بندہ کہتا ہے:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴-۲۴۱ھ) نے یہ حدیث اپنی "مُسنَد" میں زِرّ بن حُبَیْش عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ کے طریق سے تخریج فرمائی ہے؛ لہٰذا اس کی تخریج کی نسبت "مسند احمد" کی طرف کرنے والے کو وہم کی طرف منسوب کرنا بجائے خود وہم ہے؛ چناں چہ "مسند احمد" میں مکمل حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے:

"..... عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ: إِنَّ اللَّهَ نَظَرَ فِي قُلُوبِ الْعِبَادِ، فَوَجَدَ قَلْبَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرَ قُلُوبِ الْعِبَادِ، فَاصْطَفَاهُ لِنَفْسِهِ، فَابْتَعَثَهُ بِرِسَالَتِهِ، ثُمَّ نَظَرَ فِي قُلُوبِ الْعِبَادِ بَعْدَ قَلْبِ مُحَمَّدٍ ﷺ، فَوَجَدَ قُلُوبَ أَصْحَابِهِ خَيْرَ قُلُوبِ الْعِبَادِ، فَجَعَلَهُمْ وُزَرَاءَ نَبِيِّهِ، يُقَاتِلُونَ عَلَىٰ دِينِهِ، فَمَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا، فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ حَسَنٌ، وَمَا رَأَوْا سَيِّئًا، فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ سَيِّءٌ" (مسند الإمام أحمد بن حنبل، حديث: ٣٦٠٠، ص:٨٤، ج:٦، مؤسسة الرسالة: بيروت)

واللّٰہ تعالیٰ أعلم

(جاری)

حضرت مفتی محمد سہول عثمانیؒ — صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

سوانحی خاکہ

(۲/۲)

از: مولانا رفیق احمد بالاکوٹی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فقہی مسلک:

دوسری صدی ہجری میں دین حنیف کی تابعداری کی سب سے بڑی مثال ہونے کی بنا پر ''ابوحنیفہ'' کہلانے والی ہستی کے ساتھ اتباع شریعت کے حنفی منہج کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے حضرت مفتی محمد سہول عثمانی قدس سرہٗ اپنے تعارف میں حنفی کی نسبت بھی لگاتے تھے، علمائے دیوبند سے متعلق اہل بدعت کی افترا پردازیوں سے جان خلاصی اور سلف بیزار غیر مقلدین کے بے جا تعصب سے طبعی وفطری بیزاری کی بنیاد پر تکوینی امر کے تحت آپ کا مسلکی مزاج اور دینی رُخ علمائے دیوبند کی طرف جوُمڑا، اس کی بنا پر آپ ''حنیف'' اور آپ کا مزاج ورُخ ''حنفی'' شناخت کا بہترین مظہر ٹھہرا۔

حنفی مدارس میں تدریس:

چنانچہ آپ کی زندگی کے مشاغل میں فقہ حنفی اور احادیث نبویہ کی تدریس نمایاں رہی، آپ نے فراغت کے فوراً بعد سے علوم دینیہ کی تدریس وتعلیم کا مشغلہ اپنایا اور سرزمین ہند کے مختلف نامور تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تدریسی مناصب پر فائز رہے، ان اداروں میں ''مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور'' سرفہرست ہے، جہاں فراغت کے پہلے ہی سال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حکماً آپ کو صدر المدرسین کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا، تقریباً آٹھ ماہ وہاں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، اسی دوران نوسالوں سے بچھڑے ہوئے محمد سہول کی تلاش میں آپ کے بھائی مولوی محمد رسول اچانک وہاں پہنچ گئے، اور واپس بھاگل پور لے گئے، شاہجہان پور میں تدریس، بھائی کی

ملاقات اور وطن روانگی کا تذکرہ حضرت کے الفاظ میں:

''جب کل درسیات سے فارغ ہوگیا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حکماً مدرسہ عین العلم واقع شاہجہان پور میں صدرالمدرسین مقرر کر کے بھیج دیا، چونکہ اس کے قبل میں نے کسی مدرسہ میں مدرسی نہیں کی؛ اس لیے اول ہی مرتبہ صدرالمدرسی پر جانا مجھ کو بہت گراں معلوم ہوتا تھا اور میں انکار کرتا تھا؛ مگر حضرت ممدوح نے نہایت محبت سے مجھ کو فرمایا کہ'' تم جاؤ تمہاری عزت وآبرو ہمارے ذمہ ہے''، الغرض میں وہاں گیا اور نہایت حسن خوبی کے ساتھ کل کام ادا ہوتا رہا اس وقت سے اب تک بحمداللہ جہاں جہاں میں نے مدرسی کی نیک نام ہی رہا، اور برابر اب تک سلسلہ مدرسی کا قائم رہا، جب تک تقریباً آٹھ ماہ شاہ جہانپور میں مدرسی کر چکا تو ایک دن بلا اطلاع شب کے وقت جناب بھائی مولوی محمد رسول صاحب مدظلہ یکا یک ہمارے پاس پہنچے، تقریباً نو سال کے بعد بلا وہم وگمان ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو نہیں پہچانا، مگر تھوڑی دیر کے بعد پہچان لیا، اور دونوں بھائی لپٹ کر خوب دل کھول کر روئے، الغرض بھائی صاحب ممدوح مجھ کو لے کر بھاگلپور روانہ ہوئے، اور راستہ میں کانپور حضرت مولانا احمد حسن صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا نور محمد صاحب رحمہ اللہ کی قدم بوسی کرتا ہوا اور ان دونوں حضرات سے سند لیتا ہوا بھاگلپور پہنچا''۔ (تعلیم الانساب، ص:۱۶)

الغرض مدرسہ عین العلم شاہجہان پور سے علیحدگی کے بعد اپنے وطن بھاگل پور پہنچے اپنے اعزا واقارب سے ملے، خاندان کے سرپرستوں نے شادی خانہ آبادی کی ترتیب بھی بنائی، ساتھ ساتھ اصل مشغلۂ تدریس کے لیے آپ کی خدمات بھاگل پور کے ایک مدرسہ، بنام مدرسہ اصلاح المومنین محلّہ چمپانگر کا مقدر بنیں، پھر کچھ ہی عرصہ میں اپنے شیخ کی گرویدگی دوبارہ آپ کو اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی آغوش میں لے گئی اور تقریباً سات یا آٹھ برس (۱۳۲۴ھ تا ۱۳۳۱ھ) تک دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، چنانچہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''الغرض مدرسہ عین العلم شاہجہان پور، مدرسہ اصلاح المؤمنین چمپانگر بھاگل پور مدرسہ دارالہدیٰ محلّہ تانار پور بھاگل پور میں چند سال مدرسی کر کے ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس عربی مقرر ہوا، تقریباً سات یا آٹھ برس تک نہایت خوش نامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند میں (وقت) گزارا''۔ (تعلیم الانساب، ص:۱۷، ۱۸)

دارالعلوم کے عرصہ تدریس عربی میں آپ کے تلامذہ میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی

صاحبؒ جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۶۸)

دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اور دیگر مدارس عالیہ میں درس و تدریس کی تفصیل درج فرماتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کی مدرسی کے بعد مدرسہ عزیزیہ وقف اسٹیٹ بی بی صغریٰ مرحومہ، بہار ضلع پٹنہ میں ایک سال مدرس اول رہ کر چند ماہ کے لیے دیوبند بعہدۂ مدرسی درس ہوا، وہاں سے مدرسہ عالیہ کلکتہ اور وہاں سے مدرسہ عالیہ سلہٹ میں مدرس ہوکر گیا، سلہٹ سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ کا پرنسپل (مدیر) مقرر ہوکر ۳۱/مارچ ۲۰ء کو مدرسہ کا کام اپنے علاقہ لیا، یہاں سولہ سال پرنسپل رہ کر ایک سوسات روپیہ بارہ آنہ پنشن پاکر تقریباً دوسال پٹنہ میں محبی ومخلصی جناب حاجی مولوی سید عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو مسلم شریف وغیرہ پڑھاتا رہا، مولوی صاحب موصوف پٹنہ کے بہت مشہور وکیل اور بڑے دیندار تھے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم کی جگہ پر مقرر ہوکر گیا، اور تقریباً دوسال وہاں رہ کر حسب طلب واصرار گورنمنٹ آسام مدرسہ عالیہ سلہٹ کا شیخ الحدیث مقرر ہوا، اور ڈھائی سو روپیہ ماہوار گورنمنٹ آسام نے تنخواہ مقرر کیا، یہاں تقریباً سات سال فقط حدیث کی تعلیم دیتا رہا، پھر اپنی ضعیفی اور کبرسنی کی وجہ سے ترک ملازمت کردیا۔ اور اپنے وطن قصبہ پورینی ضلع بھاگل پور میں مستقل قیام کیا، الحمدللہ کہ ۱۳۶۴ھ تک چھالیس سال مسلسل یوپی، بہار، بنگال، آسام کے بڑے بڑے مدارس میں علوم عربیہ کے کل علوم وفنون کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتا رہا۔'' (تعلیم الانساب، ص:۱۹)

حضرت گنگوہیؒ سے تعلق:

انسانیت کے لیے رشد وہدایت کا سامان دین اسلام ہے، دین اسلام کی تعبیر وسط کا نام فقہ حنفی اور فقہ حنفی پر معقولیت اور اعتدال کے ساتھ عمل کرنے کا نام یوبندیت ہے اور دیوبندیت میں فقہی مدار ومعیار کا نام رشید احمد گنگوہی ہے۔

حضرت مفتی محمد سہول عثمانی صاحب قدس سرہ کو جس طرح حضرت شیخ الہندؒ سے علم حدیث کا خاص کمال اور فکر حریت کا امتیازی جذبہ حاصل تھا، اسی طرح اصلاح، ارشاد، استفادہ اور افتاء میں حضرت قدس سرہٗ کو فقیہ زمان قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ سے خاص توجہ اور رہنمائی رہبری حاصل تھی؛ اس لیے وہ اپنے آپ کو فقہ حنفی کے مطابق افتاء میں فکر رشید، طرز رشید اور تحقیق رشید کا پابند سمجھتے تھے اور اس منہج کو فقہی اساس سمجھتے تھے؛ اس لیے اپنے مسلکی ومنہجی تعارف کے واسطے اپنے نام کے ساتھ ''الرشیدی'' بھی رقم فرماتے تھے، ''تذکرۃ الرشید'' میں، ج:۲ص:۷۴، ۱۴۱، ۲۲۷،

۲۲۸، ۳۰۲، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، سے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے ساتھ آپ کا تعلق، استفادہ، استفاضہ کا تذکرہ خوب خوب ملتا ہے اور حضرت گنگوہی کے کئی احوال آپ کے زبانی یا تحریری حوالوں سے منقول ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت گنگوہیؒ کے احوال بھی تحریر فرمائے ہیں۔

منصبِ افتاء:

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی طبیعت پر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی فقاہت کا عکس ونقش بھا نپتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے لیے منتخب ومقرر کردیا تھا، آپ نے چوتھے صدر مفتی کی حیثیت سے دارلعلوم دیوبند میں ۱۳۵۵ھ تا ۱۳۵۷ھ فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی، اس دوران تقریباً ۱۵۱۸۵ فتاویٰ جاری ہوئے، حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول عثمانیؒ مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارلعلوم سے روانہ کیے گئے۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص: ۱۰۰ مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند از سید محبوب رضوی ۲/ ۲۵۶، ط: میر محمد)

دارالافتاءِ دارلعلوم دیوبند کے صدر مفتی کے عہدے پر تقرر آپ کے فقہی مقام کی سب سے بڑی سند ہے، اس دوران جو فتاویٰ آپ کے قلمِ حق رقم سے صادر ہوئے وہ بلاشبہ سند کا درجہ رکھتے ہیں، آپ کے فتاویٰ کا مکمل ریکارڈ تو دارالافتاءِ دیوبند میں یقیناً موجود ہوگا، آپ کے خاندان کے ذرائع سے چند سیکڑہ فتاویٰ ہمیں دستیاب ہوئے ہیں، جن کی تفصیل اور ان فتاویٰ پر طالب علمانہ تبصرہ بھی اس مجموعہ کے ساتھ تحریر کردیا گیا ہے، یہ مجموعہ منفرد تحقیقی فتاویٰ پر مشتمل ہے، آپ کے قیمتی اور مثالی فتاویٰ میں سے ایک لاجواب تحقیقی فتویٰ۔ "القول الصحیح فی مکائد المسیح" کے نام سے اپنے موضوع پر سند وثقاہت کی اعلیٰ مثال ہے، اس فتویٰ میں آپ نے دجال الہند مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کی واہیات کو ایسے ٹھوس دلائل وبراہین سے کفر ثابت فرمایا ہے کہ یہ فتویٰ قادیانیوں کے بارے میں اپنے پیشرو فتاویٰ کے لیے مہر وتصدیق اور اپنے معاصرین کے لیے اعتماد وکفایت اور بعد میں آنے والوں کے لیے حتمی وقطعی فیصلہ کا درجہ رکھتا ہے، اس فتویٰ کے آخری الفاظ مرزائی جماعت کے نام کی تعیین کے بارے میں یوں رقم ہیں:

''مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ قصبہ قادیان ضلع گورداسپور کا باشندہ تھا؛ اس لیے اس کے معتقدین کو قادیانی کہا جاتا ہے، وہ لوگ اپنی جماعت کو احمدیہ جماعت کہتے ہیں؛ مگر اہلِ اسلام مرزائی وقادیانی کہتے ہیں، اگر اہل سنت والجماعت فرقہ غلامیہ کہیں تو مناسب ہوگا، اگر ان لوگوں

کو جماعت شیطانیہ ابلیسیہ کہا جائے تو شرعاً درست ہے‘‘۔ محمد المدعو بالسہول

مدرس دارالعلوم دیوبند

۲۱؍صفر ۱۳۳۱ھ روز سہ شنبہ

اس فتویٰ پر آپ کے شیخ، شیخ العالم والہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت تھانوی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ اور دیگر اساطین علم کی تصدیق و تائید ثبت ہے، یہ فتویٰ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے شائع کردہ ’’فتاویٰ ختم نبوت‘‘ کی جلد دوم صفحہ نمبر ۳۲۹ میں شامل ہے۔

افتاء کے میدان سے وابستگی کے دوران کئی کبار اہل علم نے آپ سے فتاویٰ کی تمرین کی، جن میں دارالعلوم کے سابق مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ کا نام گرامی بھی شامل ہے، حضرت مفتی عثمانی صاحب رحمہ اللہ دارالعلوم کی تدریس وافتاء سے علیحدہ ہونے کے بعد، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ صدر مدرس اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے اور مدرسہ عالیہ شمس الہدیٰ میں بحیثیت پرنسپل ۴۶ برس تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کا مشغلہ بھی بدستور قائم رہا، اس دوران جو قیمتی، فقہی تحقیقات اور وقیع علمی فتاویٰ کے کچھ نمونے ہمیں دستیاب ہوئے، وہ آپ کے مرتب کردہ مسودہ ’’محمود الفتاویٰ المعروف بالفتاویٰ السہولیۃ‘‘ میں موجود ہیں، جو الحمدللہ اب اہل علم کے استفادے کے لیے منظر عام پر آرہے ہیں۔

آپ کے ایک عقیدت کیش بزرگ عزیز نے آپ کے شیخ، حضرت گنگوہیؒ کے بارے میں منظوم تاثرات لکھے ہیں، اس کے آپ بھی مصداق ہیں، چار بند آپ کے فقہی مقام کی صحیح ترجمانی کررہے ہیں۔

ہیں یہ بے شبہ عالم باعمل — یہ کہنا میرا ہے نہیں بے عمل
کہ اس مانند ان کے کہیں — میری رائے میں کوئی ہرگز نہیں
اس اقلیم میں جو ہے ہندوستان — ہیں اڈورڈ ہفتم جہاں حکمراں
فقیہوں کے سردار و پیشوا — مجدد کے ہونے میں ہے شبہ کیا

(ارمغانِ سخی، مولوی فقیر حسن ۱۳۲۱ھ)

خود حضرت عثمانی کے بارے میں ارمغان میں ہے:

وہ زاہد ہیں عالم باعمل — بہت لوگ کم ہیں ایسے آج کل

نہیں درس کی ان سے چھوٹی کتاب حقیقت میں ہیں فاضل لاجواب
مسائل کو تحقیق سے حل کیا کمال اس میں ان کو بہت کچھ ہوا
یہ ارث ہے ان کو خاندان کا ملا یقیناً رہے گا جس میں فاضل صدا
نہیں ایسا کوئی بھی دیکھا گیا جو بے علم اس خاندان میں رہا
اثر ہوتا ہے خاندان کا ضرور پدر کا پہنچتا ہے ورثہ ضرور

تصوف میں چشتی:

حضرت مفتی محمد سہول عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح ظاہری علوم وفنون کے اعلیٰ مدارج کے لیے اپنے زمانے کے ائمہ فن کا انتخاب فرمایا تھا، اسی طرح روحانی وباطنی علوم کے حاصل کرنے کے لیے بھی ایسی ہستیوں کے دامن سے وابستہ ہوئے جن کی روحانی پرواز ہر وقت تجلیات ربانیہ کے سایہ میں رہتی تھی اور امام ربانی ان کا لقب تھا تذکرۃ الرشید میں خود حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے منقول ہے:

''مولوی محمد سہول صاحب صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی) کے وصال کے بعد مجھے سید طاہر صاحب رئیس مولانگر ضلع مونگیر سے ملنے کا تفاق ہوا، حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا تذکرہ کیا گیا، سید صاحب چشم نم ہوئے اور قسم کھا کر فرمایا کے ایک دن میں اپنے مرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا بزرگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ ایک شخص نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی حالت دریافت کی، مجھے خوب یاد ہے حضرت مولانا نے یہ الفاظ فرمائے کہ ''مولانا رشید صاحب کا کیا حال پوچھتے ہو؟ وہ تو دریا پی گئے اور ڈکار تک نہ لیا!'' حضرت کی زبان مبارک سے جس وقت میں نے یہ ارشاد سنا، اسی وقت سے میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے واقف ہوں اور بڑا بزرگ سمجھتا ہوں۔''

''مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یوں فرمایا کرتے تھے! میں مفہوم ولی کا قائل ہوں، مگر مصداق ابھی تک نہیں پایا زمانہ ماضیہ میں ولی کے مصداق بکثرت پائے جاتے تھے، مگر فی زماننا بجز، حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے ولی کا کوئی فرد نہیں گزرا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول غلبہ حال تھا یا کوئی بہت اونچا مضمون ذہن میں جما ہوا تھا جس کو ولی میں دیکھنا چاہتے تھے، یا ممکن ہے کہ جو بات حضرت امام ربانی قدس سرہٗ میں دیکھی وہ دوسری جگہ نہ پانے کے سبب انتفاء فرمایا، ورنہ عالم خالی نہیں ہر زمانہ اور ہر جگہ حق تعالیٰ نے اپنے مقبولین کو پھیلا رکھا ہے یہ اور بات

ہے کہ مناصب جدا جدا اور مراتب علیحدہ علیحدہ ہیں۔'' (تذکرۃ الرشید ۲/۳۲۱)

یہی امام ربانی جن کے مرتبہ اور مقام کی نشاندہی وقت کے اہل اللہ اور اصحاب کشف بزرگوں نے فرمارکھی تھی، حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ربانی کے متعلق ایک اتہام کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جو جواب دیا وہ حضرت امام ربانی کے روحانی مقام کا عکاس اور آپ کی تحریر میں تصویبِ الٰہی کا غماز ہے، تذکرۃ الرشید میں ہے:

''جس زمانے میں مسئلہ امکانِ کذب پر آپ کے مخالفین نے شور مچایا اور تکفیر کا فتویٰ شائع کیا، سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی کی مجلس میں کسی مولوی نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا ذکر کیا اور کہا کہ امکانِ کذب باری کے قائل ہیں، یہ سن کر سائیں توکل شاہ نے گردن جھکالی اور تھوڑی دیر مراقب رہ کر منہ اوپر اٹھا کر اپنی پنجابی زبان میں یہ الفاظ فرمائے ''لوگو! تم کیا کہتے ہو میں مولانا رشید احمد صاحب کا قلم عرش کے پرے چلتا دیکھتا ہوں''۔ (تذکرۃ الرشید ۲/۳۲۲)

تذکرہ کے اسی صفحہ پر مدینہ منورہ کے ایک ولایتی (کابلی) بزرگ کی روایت منقول ہے کہ یکتائے عصر بزرگ آپ کی صحبت و بیعت کو متلاشیانِ کمال کی آخری امنگ قرار دیا کرتے تھے:

''وہ (ولایتی بزرگ) فرمانے لگے میں مدت تک بغداد، بصرہ، عراق وشام اور دیگر بلاد اسلامیہ میں سیاحت کرتا اور اہل اللہ کا متلاشی رہا ہوں، پھرتا پھراتا جب شہر حلب میں پہنچا تو ایک شیخ کامل یکتائے عصر، متبع سنت، علامہ زمن مولانا حسام الدین قادری نقشبندی کی زیارت نصیب ہوئی اور میں ان سے بیعت ہوگیا، ڈھائی سال انھوں نے مجھ کو اپنی خدمت میں رکھا اور مجاہدے کرائے اس سال یوں ارشاد فرمایا ہے کہ تم ہندوستان جاؤ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوکر آؤ، اگر مولانا قیام کو فرمائیں تو وہاں ٹھہر جانا اور فیوض حاصل کرنا؛ مگر جانے میں عجلت کرو کہ حضرت کا وصال جلد ہونے والا ہے''۔ (تذکرۃ الرشید ۲/۳۲۲)

ان روایات سے حضرت امامِ ربانی کے رتبۂ مشیخت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کے مقام ومرتبہ کی مزید معرفت کے لیے ''الإعلام بمن فی تاریخ الهندمن الأعلام'' (ملاحظہ ہو، القرن الرابع، بحرف الراء)۔

حضرت مفتی محمد سہول عثمانی قدس سرہٗ علمی مراتب کی طرح روحانی منازل میں رتبۂ کمال کی طلب صادق رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں امام ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ جیسا شیخ عطا فرمایا، جو ''والّذین جاهدو فینا لنهدینهم سبلنا'' کا بہترین مصداق ومظہر ہے، ارباب سلوک

خوب آگاہی رکھتے ہیں کہ شیخ کے انتخاب میں تأمل چاہیے بیعت کے لیے قلبی میلان چاہیے اور استفادہ کے لیے بے حجابی بے تکلفی بھی ضروری ہے، حضرت مفتی محمد سہول عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ حضرت امام ربانی سے کیسی بے تکلف مناسبت تھی اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے:

''مولوی محمد سہول ایک بار کسی مسئلہ پر حجت کرنے لگے، اعتراض پہ اعتراض اور شبہ پر شبہ، جب تقریر طویل ہوئی تو (حضرت گنگوہی) نے فرمایا تمہارا نام سہول کس نے رکھا ہے؟ تم میں سہولت بالکل بھی نہیں تمہارا نام ہونا چاہیے سئول، کہ سوال بہت کرتے ہو''۔ (تذکرۃ الرشید ۲/۷۴)

چنانچہ امام ربانی قطب زمانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کے یہ بے تکلف مرید بے حجابانہ محابا استفادہ کرکے آپ کی روحانی نسبت چشتیہ صابریہ کے حامل ہوئے، نیز چشتی کی معزز نسبت بھی آپ کی نسبتوں میں اضافہ کا ذریعہ بنی اور آپ ''چشتی'' بھی کہلائے۔ ذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء.

مگر یہ حقیقت، زیادہ تر اخفاء کے دبیز پردوں میں چھپی رہی، حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کے مختلف گوشوں سے بدیر بعد از تلاش بسیار آگاہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ اکابر دیوبند کی روایات کے عین مطابق خودنمائی سے حد تک دور تھے، بل کہ اخفا کا غلبہ حد درجے کا تھا۔ اور یہی تصوف کی حقیقی روح بھی ہے کہ انسان فنائیت کے سبق پڑھ کر ہی واصل بالباقی ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظہر آئندہ اقتباس بھی ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ سے مجاز صحبت و بیعت و خلافت ہونے کے باوجود ہمیشہ اخفا کے پردوں میں چھپا رہنا آپ کو پسند تھا؛ چنانچہ تصوف کے موضوع پر آپ کے تحریر کردہ کتابچہ ''حقیقۃ الوصول المعروف بہ روح التصوف'' کے ضمیمے میں آپ کے صاحبزادہ گرامی حضرت مولانا محمود احمدؒ لکھتے ہیں:

''حضرت کا مشغلہ زیادہ تر درس و تدریس اور فتوی نویسی کا تھا، کتب بینی آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، بعض اوقات وقت کے مناسب خدام کے تقاضے پر آپ جلسے میں شرکت فرما کر وعظ و نصیحت فرمایا کرتے۔ آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے، شوال ۱۳۲۳ھ میں جب حضرت گنگوہیؒ نے مولانا سہول عثمانیؒ کو رخصت فرمایا تو اپنا ملبوس پیراہن اور ایک عمامہ آپ کو عطا فرما کر آپ کو نعمت خلافت سے نوازا اور یہ فرمایا کہ جب کوئی اللہ کا نام لینا چاہے تو اس کو بتا دینا۔ خود حضرت گنگوہیؒ نے بھی آپ کی بستی کے اطراف میں اپنے بعض مرید کو تحریر فرمایا کہ وہاں تم سے قریب ہی مولانا محمد سہول صاحب ہیں، ان سے تم مل کر جو دریافت کرنا ہو دریافت کرلیا کرو۔

بایں ہمہ حضرت مولانا محمد سہول صاحب نے اس کو اس قدر مخفی رکھا کہ جب تذکرۃ الرشید دیوبند میں لکھا جارہا تھا، اس وقت حضرت والد مولانا محمد سہولؒ دیوبند میں مدرس تھے، مگر آپ نے اپنا نام مجازین میں ظاہر نہیں فرمایا۔ اور اپنے کو اپنے محبوب استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا اور ریاضت تفصیلی سے اپنے کو مزین فرمایا، آخر کار وہاں سے بھی نعمت خلافت سے مشرف ہوئے، جب آپ کا نام حیات شیخ الہند میں حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ نے شائع فرمایا تو لوگوں کو معلوم ہوا، مگر حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ العزیز سے خلافت کا واقعہ تو شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔

آپ ہمیشہ اپنے کو مخفی رکھتے اور بیعت کرنے سے اجتناب فرمایا کرتے، عوام میں تو جو طالب صادق معلوم ہوتا تو اس کو درخواست پر سلسلے میں داخل فرمالیا کرتے، مرید کرنے سے قبل پڑھے لکھے لوگوں کو استخارہ کراتے اور خاص کر علما اور امرا کو تو مرید اس وقت تک نہ فرماتے جب تک کہ خوب اچھی طرح مطمئن نہ ہوجائیں، بعض اوقات یہ بھی ارشاد فرماتے کہ دیکھو خوب اچھی طرح سوچ لو، ایسا نہ ہو کہ پھر بعد میں تم کو پچھتانا پڑے، چنانچہ بعض کو صرف یہ کہہ کر واپس فرمادیتے کہ تم کو مجھ سے مناسبت نہیں ہے، کہیں اور جگہ جاؤ، کسی کو تھانہ بھون اور کسی کو حضرت مدنیؒ کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیتے۔

اسی طرح خلافت بھی آپ ہر کسی کو عطا نہیں فرماتے، جو حضرات بہت محنت کش ہوتے اور قوت یادداشت میں ملکہ راسخہ پیدا ہوجاتا اور نسبت باطن پیدا ہوجانے کے بعد، آپ غور وفکر فرماتے، حتی کہ جب بشارت غیبی پاتے تو پھر آپ منصب عطا فرماتے، آپ کے نزدیک اس منصب خلافت کے لیے عالم ہونا ضروری تھا۔

ایک موقعہ پر حضرت والا نے ایک صاحب کے استفسار پر بندے کے سامنے فرمایا کہ ہمارے تمام خلفا الہامی ہیں، پھر آپ تحریری خلافت نامہ عطا فرمانے کے ساتھ نصیحت بھی فرمایا کرتے، چنانچہ ایک صاحب کے خلافت نامہ میں جو تحریر فرمایا وہ یہ تھا:

''تم کو میں نے بارہا کہا ہے کہ اجازت یافتہ اگر دوسری چیزوں میں مشغول رہتا ہے تو اس کی صلاحیت جاتی رہتی ہے، اپنے معمولات میں برابر مشغول رہو اور اتباع سنت اور اجتناب عن البدعۃ والمعصیۃ میں پختگی حاصل کرو، نیا مولوی، نیا وکیل، نیا ڈاکٹر پریکٹس نہیں کرے گا تو وہ فقط نام کا مولوی، وکیل اور ڈاکٹر رہ جائے گا، کام کا نہیں ہوگا۔ تعلیم الدین کے آخر میں جو وصایا لکھے

ہیں، اس کو ہمیشہ دیکھا کرو اور اس پر عمل کرو۔''

وہ خوش قسمت افراد جن کو حضرت والا نے خلافت کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمایا، ان کے نام نامی یہ ہیں:

۱-مولانا الحاج حافظ دیانت احمد صاحب موضع ڈہرپور پوسٹ پورینی ضلع بھاگلپور (بہار)

۲-مولانا الحاج قاری محمد ابراہیم صاحب احمد آبادی مقیم حال قاضی داڑہ چکلہ مسجد منگرول ضلع جونہ گڑھ۔

۳-مولانا الحاج قاری سید احمد صاحب موضع پڑیا پوسٹ نیمی ضلع مونگیر بہار (تاریخ اجازت ۳ شعبان ۱۳۵۸ھ)

۴-الحاج مولوی سید شاہ نجم الدین صاحب محلّہ دریاپور بانکی پور پٹنہ، بہار۔

۵-مولانا سید شاہ جمیل الحق صاحب مرحوم موضع سید پور ضلع سلہٹ مشرقی پاکستان (تاریخ اجازت یکم رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ)

۶-مولانا سید قاضی عبدالرؤوف صاحب مرحوم ضلع سید پور سلہٹ (مشرقی پاکستان)

۷-مولانا سید محمد احمد صاحب مرحوم سید پور ضلع سلہٹ (مشرقی پاکستان)

۸-مولانا قاری سید حبیب الرحمٰن صاحب موضع سید پور ضلع سلہٹ (مشرقی پاکستان) (تاریخ اجازت ۲۴ شوال ۱۳۶۲ھ)

۹-مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم موضع سید پور ضلع سلہٹ (مشرقی پاکستان)

۱۰-مولانا عبدالحسیب صاحب موضع پانچگرام سبدر پور ضلع کچھار، آسام

۱۱-مولانا الحاج سید تفضّل حسین صاحب گورنمنٹ مدرسہ، سلہٹ (مشرقی پاکستان، تاریخ اجازت ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ)

(ضمیمہ ''حقیقۃ الوصول المعروف بہ روح التصوف'' مؤلفہ حضرت مفتی محمد سہول صاحبؒ از مولانا محمود احمد عثمانی بن حضرت مفتی محمد سہول عثمانیؒ ص: ۴۰ تا ۴۲ طبع اشرفیہ کتب خانہ سلہٹ)

حضرت مفتی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت گنگوہیؒ سے استرشادی نسبت اور استفاضی تعلق کے کمال کی ترجمانی مولوی فقیر حسن مرحوم نے اپنے منظوم کلام میں یوں پیش فرمائی:۔

کمال مریدی سے فائز ہوئے نہ اس فخر سے بھی خالی رہے
ہوئی جن سے حاصل ہے بیعت انھیں جہاں میں وہ مشہور و معروف ہیں

شہہ کشور و زہد وتقویٰ ہیں وہ ہیں سب چشمۂ علم دریا ہیں وہ
ادب وتعظیم سے اے قلم بس اب کردے اس مثنوی میں رقم
تو اس گرامی عالی جناب کہ درگاہ حق میں وہ ہے مستجاب
وہ شاہ رشید احمد باصفا سر اولیاء سرور اتقیاء
جہالت کی ظلمت کے مہر منیر غریق ضلالت کے وہ دستگیر
وطن آپ کا حق نے جس کو کیا مقدس ہے قصبہ وہ گنگوہ کا

وفات، تدفین:

مؤرخہ ۲۷؍رجب ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۸ء آپ کی روح مبارک اعلیٰ علیین کی جانب محوِ پرواز ہوئی اور پورینی کے خاندانی قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔

فنوّر اللّٰہ مرقدہ، و برّداللّٰہ مضجعہ، ووسّع مدخلہٗ و جعل قبرہٗ روضۃً من ریاض الجنۃ.

❁ ❁ ❁

مصادر مراجع

(۱) تعلیم الانساب (خودنوشت) مولانا مفتی محمد سہول عثمانی رحمہ اللہ (مخطوطہ)
(۲) سفرنامہ اسیر مالٹا، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، دارالاشاعت کراچی۔
(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دارالاشاعت کراچی۔
(۴) مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند، مولانا سید محبوب رضوی، میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی۔
(۵) دارالعلوم دیوبند نمبر، ماہنامہ الرشید ساہیوال، جامعہ رشیدیہ ساہیوال۔
(۶) علماء ہند کا شاندار ماضی، مولانا سید محمد میاں، مکتبہ رشیدیہ اردو بازار کراچی۔
(۷) فتاوی دارالعلوم دیوبند، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مرتبہ مفتی ظفیر الدین، دارلاشاعت کراچی۔
(۸) مشاہیر علماء، ڈاکٹر فیوض الرحمٰن، فرمٹینر پبلشنگ کمپنی اردو بازار لاہور۔
(۹) تذکرۃ الرشید (حیات حضرت گنگوہیؒ)، مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور۔
(۱۰) بیس بڑے مسلمان، مولانا رشید احمد ارشد، مکتبہ رشیدیہ ساہیوال۔
(۱۱) فتاوی ختم نبوت، مرتبہ: مولانا سعید احمد جلال پوری، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی۔
(۱۲) دارالعلوم دیوبند، احیاء اسلام کی عظیم تحریک، مولانا اسیر اوردی، مکتبہ خلیل اردو بازار لاہور۔
(۱۳) الطبقات الکبریٰ، محمد بن سعد ابوعبداللہ البصریؒ، دار بیروت ودار صادر بیروت لبنان۔
(۱۴) سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الذہبیؒ، تحقیق شیخ شعیب ارناؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۴۰۵ھ۔
(۱۵) الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الأعلام المعروف بـ نزھۃ الخواطر، مولانا عبدالحی الحسنی، دار ابن حزم بیروت، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء۔
(۱۶) مؤلفین فتاویٰ عالمگیری، مولانا مجیب اللہ ندوی، دیال سنگھ لائبریری لاہور۔